عمر ریوا ایلا کا ناول

ماتم ایک عورت کا

ترجمہ : آصف فرخی



PDF BY

عالمی کتابوں کے اردو تراجم

www.facebook.com/akkut

عمر ریوا بیلا

ماتم ایک عورت کا

(ناول)

ترجمہ

آصف فرّخی

ناشر



Pakistan Association For Mental Health

13 HILAL-E-AHMER HOUSE, KHAYABAN-E-IQBAL, CLIFTON, KARACHI, PAKISTAN. PH : 537249

زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے

اس کتاب کا دائرہ عمل لاطینی امریکا کا ملک ارجنٹینا ہے جہاں حکومت کی تبدیلی نے ایسی فوجی آمریت کو فروغ دیا کہ جس نے ملک پر شکنجے جیسی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے ہزاروں افراد کو ''غائب'' کروادیا۔ ''غائب'' ہوجانے والے ان بے نشان اور بے آسرا لوگوں کی پوری روداد کیسے معلوم ہوسکتی ہے، لیکن اس طویل اور اندوہ ناک داستان کے جو اجزاء سامنے آئے ہیں، وہ قید و بند، ظلم و تشدّد اور اذیت کے نت نئے طریقے سہتے سہتے موت کی تفصیلات بتاتے ہیں۔ یہ ناول بھی ایسی ہی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

عمر ریوابیلا (Omar Rivabella) ارجنٹینا میں پیدا ہوئے لیکن کافی عرصے سے نیویارک میں ادیب اور صحافی کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ وہ انسانی حقوق کے زبردست موید ہیں۔ ان کے متعدد افسانے اور مضامین لاطینی امریکا میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان کی بہت سی تحریریں انگریزی میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ ناولوں کے علاوہ انہوں نے ہیوی ویٹ چیمپئن حوزے توریز کی سوانح بھی لکھی ہے۔ موجودہ ناول کا انتساب بھی توریز کے نام کیا گیا تھا۔ یہ ناول انگریزی میں پہلی بار ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا اور انگریزی ترجمہ پال ریوئیرا کے اشتراک سے مصنف نے خود کیا تھا۔ اس ناول کو چھپنے کے فوراً بعد ہی بہت پسند کیا گیا۔ مشہور امریکی ناول نگار نارمن میلر نے اسے غیر معمولی ادب پارہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ ناول انسانی وقار پر دہشت کی یورش اور اذیت اٹھانے والوں کی نفسیات کا مطالعہ ہے۔ ناول نگار بڈ شلبرگ نے اسے صحیح معنوں میں ''شاک'' پہنچانے والی کتاب تسلیم کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ اسے پڑھیے اور روئیے۔ کرسچن سائنس مانیٹر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کتاب کو جھیل جانا مشکل ہے، یہ شدید مذمّت کرتی ہے اذیت کے پورے سلسلے کی، ان حکومتوں کی جو اس کے لیے احکام جاری کرتی ہیں اور ان معاشروں کی بھی جو اسے برداشت کرلیتے ہیں۔

کیا اس آخری فقرے کی زد میں، ہم اور آپ نہیں آتے؟

(باب ۱)

صبح سات بجے کی عبادت کے دوران میں نے اسے دیکھا۔ وہ گرجا کی نشستوں کی آخری قطار میں اکیلی بیٹھی تھی، گتّے کا بڑا سا ڈبّا سینے سے لگائے ہوئے، جس سے اس کا آدھا چہرہ چھپ رہا تھا۔

اس ڈبّے نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرلی جس وقت میں منبر پر کھڑے ہوکر، نظروں ہی نظروں میں اس مختصر اجتماع کا جائزہ لے رہا تھا، یہ پتہ چلانے کے لیے نہیں کہ علاقے کے لوگوں میں سے کون کون حاضر ہے، بلکہ محض عادتاً۔

اس عورت کی نظریں مجھ پر سے نہ ہٹیں اور وہ مضبوطی کے ساتھ اس ڈبّے کو گرفت میں لیے رہی۔ میں سوچنے لگا کہ اس میں کوئی نومولود بچّہ تو نہیں۔

خطبے کے دوران اس عورت اور اس ڈبّے کا خیال میرے اعصاب پر طاری رہا۔ عبادت کرتے ہوئے کئی دفعہ میں نے دزدیدہ اس کی طرف دیکھا، اور اس کی شناخت کے بارے میں کوئی نہ کوئی سراغ لگانے کی کوشش کی۔ تقریباً چھ ماہ

ہو چکے تھے جو میں نے اس حلقے کے گرجا کا انتظام سنبھالا تھا جو ایک ہزار افراد کی آبادی پر مشتمل اس بستی میں واقع تھا' اور اب تک میں بستی کے تقریباً ہر آدمی کو پہچاننے لگا تھا۔ مگر میں نے اس عورت کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ نہ گرجا میں' نہ سڑک پر۔ مجھے اچانک یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کوئی خفیہ اور عجیب بات اس صبح وقوع پذیر ہوگی۔

خطبے کے بعد جب مجمع ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگا' تو اکا دکا افراد منبر کے نیچے منتظر کھڑے ہوئے تھے کہ ذاتی معاملات پر مجھ سے مشورہ لیں' لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں سیڑھی اتر کر نیچے نہیں آ رہا۔ مگر میری ساری توجہ ڈبا پکڑے ہوئے اس عورت پر تھی' جو سپاٹ چہرے کے ساتھ سامنے تکے جا رہی تھی' وہاں سے گزر کر باہر جانے والے لوگوں کی نظروں اور بات چیت کے باوجود۔

خالی نشستوں کے درمیان اس کی تنہائی نے' جس کا تاثر اس کے بے حد پیلے چہرے سے دوچند ہو رہا تھا' اس پر تقدّس کی سی فضا قائم کر رکھی تھی۔

گرجا گھر اب خالی ہو چکا تھا۔

وہ عورت چند لمحوں تک یوں ہی بیٹھی رہی' جیسے اطمینان کر لینا چاہتی ہو کہ اب کوئی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ پھر اس نے ڈبا اپنے برابر کی نشست پر ٹکا دیا اور قطاروں کے درمیان سے نکل کر آئی۔ اس نے میری طرف چند قدم اٹھائے ہوں گے کہ میں نے غور کیا' وہ بری طرح لنگڑاتی ہے۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟"

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتی رہی' اس کی نظریں صرف میرے ہونٹوں پر مرکوز رہیں۔

"کیا تم ٹھیک ہو؟ تم کون ہو؟" میں ہکلانے لگا۔ وہ اور قریب آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میری آواز سننے کے لیے باقاعدہ کوشش کر رہی ہے۔

"میرا نام لوئزا ہے۔ میں چھ مہینے پہلے بہری ہوگئی تھی فادر" اس نے ایسے یاس انگیز لہجے میں کہا کہ میرا دل ہمدردی سے بھر آیا۔

"میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے آہستہ سے دہرایا اور ہونٹوں کو زیادہ حرکت دی۔ اس نے میرے ہونٹوں کی حرکت پڑھ لی اور رک گئی۔

"سوزانا نے یہ آپ کو بھیجا ہے" اس نے نشستوں کی قطار میں رکھے ہوئے ڈبّے کی طرف اشارہ کیا۔

پھر وہ مڑی اور دروازے کا رخ کرنے لگی۔

"سوزانا کون ہے؟" اس کو لنگڑا کر گرجے سے باہر جاتے دیکھ کر میں چیخ اٹھا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

"سوزانا کون ہے؟" میں دوبارہ چیخا۔ میں بھول گیا کہ وہ سن نہیں سکتی۔

میں نے گرجے کے باہر گاڑی کے انجن کی آواز سنی اور بھاگتا ہوا باہر گلی میں آیا تو تیزی سے رخصت ہوتی ہوئی گاڑی کی دھول میں اٹ کر رہ گیا۔

گرجے کے اندر آکر میں اس نشست کی طرف گیا جہاں وہ ڈبّا پڑا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر اسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

بڑی احتیاط کے ساتھ میں اس ڈبّے کے قریب آیا۔ آہستہ سے میں نے اپنی انگلیاں اس کے نیچے پھسلائیں اور اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اس کے وزن کا اندازہ غلط لگایا تھا اور پیچھے کی طرف پلٹ گیا اور گھبراہٹ کے مارے مَیں اپنے بے تکے پن پر ہنسنے لگا۔

اس ڈبے کو اٹھا کر میں اپنے کمرے میں لے آیا' جو گرجا گھر کے دیے ہوئے مکان میں تھا۔ ڈبے کا اوپری حصہ چپکنے والے ٹیپ کی چوڑی چوڑی پٹیوں کی مدد سے مضبوطی کے ساتھ بند کیا ہوا تھا۔ میں ڈبا کھولنے میں کامیاب ہوا تو تیز اور شدید بکھراند نے میرے ہوش و حواس پر حملہ بول دیا' جیسی بو انسانی پیشاب اور پاخانے سے آتی ہے۔ اس ڈبے کی تہہ میں جو کچھ بھی پڑا ہوا تھا' اس کے اوپر کاغذ کی بہت سی گڈیاں تھیں۔

میں ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ کسی نے مجھ سے بے ہودہ مذاق کیا ہے۔ میں ڈرنے لگا' مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس گرجے میں میرے تبادلے سے چند ماہ پہلے' بشپ انتونیلی نے مجھے خبردار کیا تھا کہ تمام تر احتیاط کے باوجود بھی میری زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ دس برس تک میں دارالحکومت میں "عفیفہ کے حمل" (INMACULADA CONCEPCION) والے حلقے میں' بشپ کے زیرانتظام مامور رہا تھا' میں نے غریب عوام کے ساتھ حکومت کے غیر منصفانہ رویے پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ میں سماجی کارکن تھا۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا تھا' بعض دوسرے پادریوں کی طرح' کہ کلیسا کو متحارب ہونا چاہیے۔ بشپ انتونیلی کے لیے میری پسندیدگی کی ایک وجہ بھی تھی کہ وہ کلیسا کے ان معدودے چند اعلا منصب داروں میں سے ایک تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ سیاسی طور پر عاجز و اطاعت گزار ہونا ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے' اور ہمارے عقیدے سے متصادم ہے۔ وہ خود اپنی شرکت سے ہماری حوصلہ افزائی کرتے اور "بے باک" پادریوں کو بچانے کے لیے ان کا تبادلہ کر دیتے۔

جن دو چار موقعوں پر میں وہیں کھانا کھاتا تھا' ان کے لیے میری ملازمہ جوانیتا نے کام چلاؤ سا باورچی خانہ بنادیا تھا' اور میں اس کی ایک دراز میں ڈھونڈتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے وہ دستانے مل گئے جس کو پہن کر وہ فرش دھویا رگڑا کرتی تھی۔

کمرے میں واپس آکر میں نے کھڑکی کھول دی تاکہ صبح کی تازہ ہوا ڈبے کی باقی ماندہ بدبو کو صاف کردے جو ابھی تک کمرے میں بسی ہوئی تھی۔

جھنجلا کر میں نے ڈبّا بند کر دیا اور لات مار کر ایک کونے میں کر دیا۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ اگلے دن تک اس سے نجات مل چکی ہو گی۔

اگلی صبح میں عبادت سے واپس آیا تو حوانیتا نے کمرہ صاف کر دیا تھا مگر وہ ڈبّا وہیں کونے میں رکھا ہوا تھا۔

"تم نے یہ کوڑا کرکٹ یہاں کیوں چھوڑ دیا؟" میں نے اسے پکار کر کہا۔

"مجھے یہ کوڑا کرکٹ نہیں لگ رہا' فادر" اس نے اسی مخصوص معصومیت سے کہا' جس کی وجہ سے مجھے شک ہوتا تھا کہ یہ مکّار ہے' اس میں بے باکی اور شرارت کا ایسا امتزاج تھا جس کے سامنے میں پسپا ہو جاتا۔

"کاغذ کے ان ٹکڑوں پر کچھ لکھا ہوا ہے' فادر" اس نے کہا۔

"لکھا ہوا ہے؟"

"جی ہاں' فادر۔"

میں نے کاغذوں کی ایک گڈّی کھولی۔ "تم واپس چلی جاؤ" میں نے اس سے کہا۔

حوانیتا جوں ہی غائب ہوئی' میں نے کاغذ کا ایک ٹکڑا کھولا۔ اتنی باریک تحریر میں کہ انکھوں پر زور دے کر ہی پڑھا جا سکتا تھا' تین پیراگراف اس طرح تھے جیسے کسی نے روزنامچہ لکھا ہو۔ ان پر تاریخ پڑی ہوئی تھی' ۱۸ جنوری۔

"آج پھر منہ پر نقاب باندھ کر مجھے اسی جگہ لے گئے۔ دھات کے زینے پر چڑھتے ہوئے دبی دبی آوازیں جو مجھے سنائی دے رہی تھیں' دروازے کھلتے ہی سیلاب بن کر امڈ آئیں۔ ہمارے داخل ہوتے ہی وہ تھم گئیں۔

"یہ پاگل پھر آ گئی؟" اسی آواز نے پوچھا جو پچھلی دفعہ مجھ پر چیخی تھی۔ "غلیظ تخریب کار رنڈی" اس نے کہا اور کوئی سخت نکیلی چیز میرے مقعد میں گھسیڑ دی۔"

میں نے اپنی بے صبری پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ یوں ہی بے ڈھنگے پن سے میں نے کاغذ کے چند اور ٹکڑے کھولے۔ ان کو پڑھتے ہوئے میں متلی کی کیفیت سے بے حال ہوگیا' میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ ایک ناقابل برداشت کرب میرے اوپر طاری ہوگیا' جس طرح آج سے دس سال پہلے اپنی بہن کے خط کے ابتدائی الفاظ پڑھ کر ہوا تھا جس میں ماں کی موت کی اطلاع تھی۔

میں کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا کہ میرے بچے کھچے حواس قابو میں آجائیں۔ میں پھر حوانیتا کے پاس باورچی خانے چلاگیا۔ میں نے اس سے کہا کہ کافی پھینٹے' اور جان بوجھ کر اسے ادھر ادھر کی باتوں میں الجھائے رکھا کہ میرا دھیان بٹا رہے۔

کمرے میں واپس اکر میں نے ایک مٹھی میں کاغذ کے چند ٹکڑے اٹھالیے اور انہیں پڑھنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد' میں نے پڑھنا بند کردیا اور باقی پورے دن بستی کے مضافات کی کچی آبادی میں کیچڑ بھری گلیوں میں آوارہ پھرتا رہا' اس آسیب کو دور نہیں کرسکا جو اب میری زندگی پر مسلّط ہوگیا تھا۔

پھر ایک رات میں نے کاغذ کی چند اور پٹّیاں اس احمقانہ یقین کے ساتھ اٹھالیں کہ کاغذ کے یہ پرزے جس طرف بھی لے جائیں' اس چیلنج کا سامنا کرنے کی قربانی کے لیے تیار تھا۔ اس لمحے کے بعد سے میں نے اپنی باقی تمام سرگرمیاں ختم کرکے اس نامعلوم عورت کی ڈائری کو پڑھنے اور ترتیب دینے میں لگ گیا۔

(باب ۲)

اگلے پورے ہفتے میں صرف خطبہ دینے کے لیے اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ میرے خطبے کمزور تھے اور میرے وعظ اثر سے عاری۔ عبادت کرنے والوں کو متاثر نہ کرسکنے پر شرمندہ ہوکر سیدھا کمرے میں واپس آجاتا۔ میں حوانیتا کو بھی

اندر نہیں آنے دیتا۔

وہ سمجھتی ہوگی کہ میں پاگل ہوگیا ہوں۔ کمرہ کچرے کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ کاغذ کے ٹکڑے سارے فرش پر اور میز کے اوپر بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ الماری کے پٹ پر اور لکڑی کے تختوں پر پن سے لگے ہوئے تھے۔ جن ٹکڑوں پر میں اس وقت کام کررہا تھا' وہ الگنی کی چٹکیوں سے اس تار پر ٹنگے ہوئے تھے جو میں نے کمرے کے بیچوں بیچ باندھ دیا تھا۔ میں ان ٹکڑوں کی عبارت پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ تار کی لمبائی مجھے ایک وقت میں پانچ دنوں کے روزنامچے وہاں ٹانگنے کی اجازت دیتی ہے۔ کام اتنا بے ترتیب نہیں تھا جتنا پہلی نظر میں معلوم ہوتا تھا' مگر اس وجہ سے پیچیدہ ہوگیا تھا کہ میں جس عبارت کو مکمل سمجھ کر نقل کرتا' تو آخر میں وہ متن ناقابل فہم ہوجاتا۔ مجھے فرش پر بکھرے ہوئے کاغذوں میں تلاش کرکے اس دن سے تعلق رکھنے والا ٹکڑا ڈھونڈنا پڑتا۔ دوسرے حالات میں شاید میں زیادہ مکمل منصوبہ بناپاتا' لیکن پریشانی مجھے کھائے جارہی تھی۔ اس الجھاوے کی پیچیدگی ناقابل برداشت حد تک ترغیب انگیز تھی۔

(باب ۳)

۶ جنوری

صبح چار بجے کے قریب دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا' اور جب میرے ابّا نے پوچھا کون ہے' تو انھوں نے سنا ایک آواز حاکمانہ لہجے میں اپنی شناخت کرارہی ہے کہ پولیس۔ چوں کہ میرے ابّا ڈاکٹر ہیں اور پہلے کئی مرتبہ پولیس والوں نے ان سے شدید طور پر زخمی ہوجانے والے کسی نہ کسی "کیس" کا علاج کروایا ہے' اس لیے انھوں نے بے جھجک دروازہ کھول دیا۔ فوجی لباس میں چھ آدمی اندر کے کمرے میں گھس آئے اور راستے میں آنے والی ہر چیز کو گراتے گئے۔ امّی اور میں کمرے میں عین اس لمحے پہنچے اور ہم بس یہ دیکھ سکے

کہ ایک فوجی نے بندوق کا دستہ ابّا کے سر پر دے مارا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان میں سے دو آدمی امّی کو دھکیلتے ہوئے سونے کے کمرے میں لے گئے اور باقی جو تھے وہ میری طرف لپکے۔ ایک نے موٹا سا نقاب میرے چہرے پر باندھ دیا اور باقی دو مجھے مضبوطی سے پکڑے رہے جب میں نے اپنے آپ کو چھڑانا چاہا۔ یہ سب ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ آج، جب کہ اتنا بہت کچھ بیت چکا ہے، مجھے اب بھی اپنے شب خوابی کے لباس کے کھنچ کر پھٹ جانے کی آواز یاد ہے اور وہ گھبراہٹ جو مجھ پر اس وقت طاری ہوگئی جب چاروں طرف سے نرغے میں آکر لڑتے ہوئے میں نے گھونسا اس سپاہی کی جانگھ میں مارا جو مجھے ہتھکڑیاں پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ مجھ سے بھڑ گئے اور دھکیلتے ہوئے گھر کے باہر لے گئے۔ میں نے ابّا کے بے ہوش جسم سے ٹھوکر کھائی۔ میں نے سنا کہ ان میں سے ایک پوچھ رہا ہے:

"ان بڈّھوں کا کیا کریں؟"

"یہ بڈّھا تو کچھ دیر سوتا رہے گا" کسی نے جواب دیا۔

"اور وہ بڑھیا؟"

کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں بے ہوش ہوگئی۔

جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک گاڑی کے فرش پر ڈھیر پایا اور فوجی بوٹ میرے بدن کو روند رہے تھے۔ کسی نے پوچھا:

"کیا خیال ہے، کر ڈالیں؟" اس کے ساتھی نے جواب میں انکار کیا اور اس کے بعد سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

مجھے صرف انجن کی آواز آرہی تھی، اور میں نے اندازہ کیا کہ ہم سڑک پر چل رہے ہوں گے۔ پھر راستے میں آنے والے موڑوں سے مجھے خیال ہوا کہ ہم شہر کے اندر ہی ہوں گے اور چاروں طرف چھایا ہوا سناٹا علی الصبح سے مخصوص ہے۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ ہم کتنی دیر تک سفر میں رہے، مگر جب آخر کار مجھے گاڑی سے گھسیٹ کر نکالا گیا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ روشنی کی رمق بھی اس نقاب میں داخل نہیں ہوسکتی تھی جو مجھے پہنا دیا گیا تھا۔ مجھے قید کرنے والوں کے بوٹ چرمر بول رہے تھے جب ہم ایک برآمدے سے گزرتے ہوئے ایک کھلی جگہ میں پہنچے، جہاں مجھے دوسرے لوگوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمیں کتنی دیر وہاں کھلے میں رکھا گیا مگر کچھ یاد سا آتا ہے کہ روشنی اور اندھیرے کے وقفے تھے جیسے رات دن میں ڈھل رہی ہو۔ مجھے تین چار دن وہاں رکھا گیا۔

۹ جنوری ؟

کھلی جگہ پر گزرنے والے دنوں میں میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی اور دن میں بس دو مرتبہ کھانا ملتا رہا۔ میری بار بار کی درخواست کے باوجود مجھے غسل خانے جانے کی اجازت نہیں مل سکی ۔ نہ دوسروں کو مل سکی ۔ دوسرے دن کے بعد سے پیشاب پاخانے کی بو ناقابل برداشت تھی۔

۱۰ جنوری؟

مجھے صبح سویرے کی مخصوص خاموشی کا احساس ہوا۔ میں نے اپنی داہنی چھاتی پر کسی کا کھلا ہاتھ محسوس کیا جو چوروں کی طرح میرے پاس آیا تھا۔ اچانک میں ہوا میں لٹک گئی جب دو آدمیوں نے ہنستے ہوئے مجھے اوپر اٹھالیا۔ ایک نے میری ٹانگیں پکڑیں اور دوسرے نے بازوؤں کے نیچے سے پکڑا۔ مجھے کئی دن پہلے والے اسی برآمدے میں لے جایا گیا اور ایک گاڑی میں ڈال دیا گیا جو جیپ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک اور سفر پر روانہ ہوگئے۔

میرے ساتھ جیپ کے پچھلے حصے میں سوار تین آدمی میرے جسم کی بدبو سے گھن کھا رہے تھے اور میرے سارے بدن پر حقارت کے ساتھ جوتے گڑو رہے تھے (جیسے جس کسی نے بھی یہ ذمّہ داری ان پر تھوپی تھی، اس سے انتقام لے رہے ہوں)۔

گڑھوں سے بھری کچی سڑکوں پر گھنٹہ بھر سفر کرنے کے بعد، کچھ دور سے ایک آواز نے پکار کر کہا، "ہالٹ!" اور جیپ رک گئی۔ میں نے لوہے کی ۔کارت کے بجنے کی آواز سنی۔ ہم آگے بڑھے۔ چند منٹ بعد پھر رک گئے۔ میرے تین محافظ اترے اور دو نے مل کر مجھے کھینچا اور کھرنجے فرش پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

"یہ ایک اور تخریب کار سؤرنی ہے" میرے ایک محافظ سپاہی نے کہا اور میرے پیٹرو پر لات ماری۔

"لگتا ہے چ۔ ئی میں مزہ دے گی" کسی نے کہا۔

"سڑاند کے بھبکے اٹھ رہے ہیں"۔

"لڑکے اس کو نہلا دیں گے۔" ان کے قہقہوں کا طوفان اُمڈ آیا۔

دو فوجیوں نے مل کر مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ وہ میری چھاتیاں مسوستے ہوئے میرے جسم کی بو پر مذاق کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے ایک دروازے میں سے دھکیلا، پھر دوسرے میں سے، جس میں ایسا لگتا تھا کہ شیشے لگے ہوئے ہیں۔ پچاس قدم اور آگے، پھر ہم رک گئے۔ میں نے دھات کی آواز سنی اور انہوں نے مجھے ایک پلنگ پر گرا دیا۔

میرا الٹا ہاتھ اس پلنگ کے سرہانے سے ایک زنجیر سے باندھ دیا گیا۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ میں نے اپنے کھلے ہوئے ہاتھ سے نقاب اتارنا چاہا، مگر اسے میری گردن کے پیچھے مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس وقت تک میں کوئی ایسی بات نہیں سوچ سکی تھی جو فوری نوعیت کی نہ ہو۔ اب اپنے اغوا کے بعد پہلی دفعہ میں نے اپنے والدین، اپنے منگیتر اور خود اپنے بارے میں سوچا۔

انہوں نے مجھے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا۔ ساری رات میں دوسری کوٹھریوں سے لوگوں کے گھسیٹے جانے کی آوازیں سنتی رہی۔ لیکن سب سے زیادہ تاریک چیز یہ تھی کہ میں نے کوئی انسانی آواز نہیں سنی۔ میں سسکیاں بھرنے لگی۔

۱۲ جنوری ؟

وہ مجھے دو مرتبہ غسل خانے لے گئے اور ایک اونی اسکرٹ اور خون کے دھبے لگا ہوا بلاؤز دیا۔

غسل خانے کے ایک پھیرے میں انہوں نے میرے سر پر سے نقاب اتار دی اور مجھے دکھائی دیا کہ برآمدے میں دونوں طرف دروازے تھے جو میرے والے کی طرح تھے' لوہے کے دروازے جن میں روزن تھے اور جو صرف باہر سے کھل سکتے تھے۔ میری کوٹھری میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور لوہے کی پتلی جالی تھی' اور وہ پچھلے صحن میں کھلتی تھی۔

۱۳ جنوری ؟

آج میری کوٹھری کھلی اور انہوں نے میرا نام پوچھا۔ میں اپنی آواز پر خود ہی حیران رہ گئی۔ نقاب کے اندر سے دبی دبی سنائی دینے کے علاوہ یہ بات تھی کہ اس دن کے بعد سے خود میں نے اپنی آواز نہیں سنی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ بات کرنے کی کوشش کی تھی تو مار مار کر چپ کرا دیا گیا تھا۔

چند گھنٹوں بعد میں نے دوبارہ دروازہ کھلنے کی آواز سنی' اور انہوں نے میرے نام کے ساتھ پتہ بھی پوچھا۔ انہوں نے دن میں تین چار مرتبہ میرا نام پوچھا اور میں ان انسانی آوازوں کو سن کر خوش ہوئی جو شر کا شگون نہیں معلوم ہو رہی تھیں۔

(باب ۴)

یہ کام آسان ہونے کے بجائے مشکل ہوتا جا رہا تھا جس عورت نے یہ پارہ پارہ روزنامچہ لکھا تھا (میرا قیاس ہے کہ یہ وہی "سوزانا" ہوگی جس کا ذکر

گرجے میں اس عورت نے کیا تھا)' اس نے بہت ذہانت کا ثبوت دیا تھا مگر روشنائی نم ہوگئی تھی اور پورے پورے پیراگراف دھندلے پڑ گئے تھے۔

اس سب کو مزید الجھانے کے لیے' اکثر اوقات یہ ہوتا کہ ایک اندراج تین چار حصوں میں تقسیم ہوتا اور الگ الگ رنگ کے کاغذوں پر ہوتا۔

مثال کے طور پر ۱۷ اپریل کا اندراج ماچس کی ڈبیا پر ایک مختصر نوٹ' اخباری کاغذ کے حاشیے پر ایک نسبتاً طویل نوٹ' ٹائلٹ پیپر کے ٹکڑے پر دو سطروں اور سگریٹ کی پنی کے پچھلے حصے پر تین عبارتوں پر مشتمل تھا۔

میں ایک دن کے ٹکڑوں کو نمبر شمار دے دیتا اور کمرے میں لگے ہوئے تار پر ترتیب وار ٹانگ دیتا۔

وابستگی کی اس منزل پر مجھے احساس ہوا کہ سوزانا نے زمانی تسلسل کا خیال نہیں رکھا اور بعض اوقات وہ ایک ہی جملے میں ماضی سے حال پر آجاتی۔

یہ ڈائری جس ذہنی حالت میں لکھی گئی ہوگی اس کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ ان متضاد باتوں کو ٹھیک نہیں کروں گا' اس دستاویز میں تحریف نہیں کروں گا' تاکہ اس بناؤ سنگھار میں اس کی اصل شکل نہ مٹ جائے۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے یہ ڈائری عوام میں بحث مباحثے کا سبب بنے گی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کام کے دوران جملے' ہر جذبے اور اپنے تمام تجربات کا حساب رکھوں گا۔ میں اس ڈائری کی اپنی ڈائری لکھوں گا۔

بے خوابی کے دوسرے ہفتے میں مندرجہ ذیل حصہ نقل کیا:

(باب ۵)

۱۴ جنوری

میں نے اندازہ لگایا کہ سہ پہر کا وقت ہوگا جب کوٹھریوں کے دروازے کھلنے

اور ان میں سے قیدیوں کے گھسیٹ کر باہر نکالے جانے کی آوازیں برآمدے
میں سے مجھ تک آنے لگیں۔ میں نے سانس روک لیا' اس ڈر کے مارے کہ
اگلا دروازہ جو کھلے گا' میرا ہی ہوگا۔

میں نے تالے میں چابی داخل ہونے کی آواز سنی۔ میرے کپڑے گیلے
ہوگئے۔ انہوں نے میرے پیروں میں بیڑیاں پہنا رکھیں تھیں' وہ کھولیں اور اس
زنجیر کو کھولا جو مجھے پلنگ کے سرہانے سے باندھے ہوئے تھی۔ میں اپنے پیروں
پر کھڑی ہوگئی تو میرے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کرکے دوبارہ باندھ دیے۔

"آپریشن روم کی طرف !" میں نے کسی کو چیختے ہوئے سنا اور وہ مجھے
برآمدے میں دھکیلنے لگا۔ کھردرے فرش سے میرے ننگے پاؤں لہولہان ہوگئے۔
کسی نے میرا سر نیچے کر دیا کہ جس گاڑی میں مجھے لے جایا جارہا تھا' اس کے
دروازے کی لکڑی سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے آپ کو بے ہوش نہ کرلوں۔ گاڑی کی
ڈکی میں مجھے فرش پر ڈال دیا اور وہاں جو سپاہی بیٹھے ہوئے تھے' اپنے بوٹوں کو
میرے بدن پر ٹکا کر آرام سے ہوگئے۔

گھنٹہ بھر تک گاڑی چلتی رہی۔

آخر کار گاڑی رکی اور مجھے وائرلیس ٹیلی فون کی آواز آئی۔ سامنے کی سیٹ
پر بیٹھے ہوئے سپاہیوں میں سے ایک نے "مکڑی" یا اس قسم کی کوئی اور بات
کہی' اور چند لمحوں کے بعد میں نے لوہے کے بھاری پھاٹک کے چرچرا کر کھلنے کی
آواز سنی۔ گاڑی تھوڑا اور آگے چلی' پھر رک گئی۔ مجھے گھسیٹ کر باہر کر دیا
گیا۔ مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں میں نے شیشے کے گلاس ٹکرانے کی
آواز سنی (کیا وہاں لوگ پی رہے تھے؟) اور وہاں پر کئی لوگوں کی موجودگی کا
احساس ہوا۔ میں نے اپنے اوپر بہت سی آنکھیں چبھتی ہوئی محسوس کیں اور پھر
میں نے سنا کہ جو لوگ مجھے یہاں لے کر آئے ہیں' ان میں سے ایک کہہ رہا
ہے: "عیش کرو۔"

مجھے ایک پتلے برآمدے میں سے گزار کر ایک کمرے میں لایا گیا۔ میری

ہتھکڑیاں کھول دی گئیں ۔ انہوں نے میرے کپڑے اتار دیے ' ہر جگہ ٹٹول کر اور مسوس کر دیکھا ' پھر میری نقاب اتار دی ۔

اس کمرے میں ایک میز ' ریڈیو اور تیز روشنی تھی ۔

چھت سے ٹنگی ہوئی رسیوں میں قصائیوں والے آنکڑے لگے ہوئے تھے ۔ دو ننگی عورتیں ' ہاتھ پاؤں سے بندھی ہوئی ' لوہے کی غلیظ اور خون آلودہ مسہریوں کے خالی ڈھانچے کے اوپر ڈھیر پڑی ہوئی تھیں ۔

اس کمرے میں تین آدمی تھے ۔ ان میں سے ایک کو ذمہ دار اور کام کی لگن رکھنے والا استاد سمجھا جاسکتا تھا ' اس کے صاف ستھرے حلیے اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ۔ باقی دونوں آدمی ایسا لگتا تھا کہ ان گھٹیا فلموں سے نکلے ہوئے کردار ہیں جو غنڈوں اور نشہ بازوں کے بارے میں ہوتی ہیں ۔ وہ ایک دوسرے کو نام کے بجائے عرفیت سے پکار رہے تھے ۔ ایک جسے "نارز" کہا جارہا تھا ' اس کی شکل پکے ٹھکے بازوں جیسی تھی ' اور دوسرا "ایل رینگو" ٹھگنا تھا اور ایک پیر سے لنگڑاتا تھا ۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور گھورنے کے انداز سے مجھے بہت گھن آرہی تھی ۔

"نارز" اور "ایل رینگو" نے مجھے مسہری کے خالی ڈھانچے پر دھکیل دیا اور میرے ہاتھ اور پیر اسی طرح باندھ دیے جس طرح ان دونوں عورتوں کے بندھے ہوئے تھے ۔

پھر انہوں نے میرے پاؤں کے انگوٹھے سے بجلی کا تار باندھ دیا ۔

قریب ہی ' پیٹھ پر بندھے ہاتھ والا ایک آدمی ' تقریباً تیس برس کی عمر کا اور ایک نوجوان ' تقریباً سترہ برس کا ' کھڑے ہوئے تھے ' اور دونوں کی نگرانی ایک گارڈ کر رہا تھا ۔ ان کی آنکھوں سے ' جو نفرت اور کرب سے بھری ہوئی تھیں ' میں سمجھ سکتی تھی کہ یہ ان دونوں عورتوں کے شوہر یا بھائی یا محبوب تھے ۔

جب ان لوگوں نے مجھے پورا باندھ دیا تو ان دونوں عورتوں میں سے زیادہ عمر والی کی طرف گئے ' اور وہ شخص جو استاد معلوم ہوتا تھا ' بجلی کا تار اسے لگانے

لگا اور نارز اور ایل رینگو دیکھتے رہے۔

زیادہ عمر کا آدمی بڑبڑانے لگا "اینا"..... "اینا"..... "اینا" اور میں ہڈیوں میں گودا جما دینے والی چیخیں سنتی رہی۔

اذیت دینے والا بار بار اس عورت سے پوچھتا رہا کہ دہشت گردوں کا اسلحہ خانہ کہاں ہے مگر وہ جواب سننے کا انتظار بھی نہ کرتا اور "لاپیکانا" دوبارہ لگانے لگتا، کہ یہ مذاق کا وہ نام تھا جو انہوں نے اس شیطانی بجلی کے تار کو دے رکھا تھا۔ نارز نے اذیت رسانی کا سلسلہ روک دیا اور زمین کا تار جوڑنے لگا، جو دوسری عورت کے پیروں پر سے گر گیا تھا۔ وہ عورت نہیں، سولہ سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔

ایل رینگو چلتا ہوا میری طرف آیا اور دوسرا تار ہاتھ میں لے کر بول اٹھا:

"اور اس تخریب کار غلیظ رنڈی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

اس نے جب بجلی کے تار سے میرا سر، میری آنکھوں کے پپوٹے اور میرے بازو چھوئے، تو صدمے کی ایک لہر میرے سارے بدن میں آسمانی بجلی کی طرح تیر گئی، میرے دل کی دھڑکن کا انداز بدل گیا۔ مگر جب اس نے میری چھاتیوں کو چھوا، تو مجھے درد ہی نہیں غصہ بھی آیا۔

وہ بجلی کا تار دھیرے دھیرے میرے پیٹ سے نیچے لاتا رہا اور سارے وقت میری لرزش دیکھتا رہا۔ اس نے کئی بار میری شرم گاہ کے گرد تار گھمایا اور اس کو تار سے چھو دیا۔

اچانک اس نے تار میرے مقعد میں گھسیڑ دیا اور بھیانک درد کی شدت مجھے دیوانگی کی سرحدوں تک لے آئی۔

اس دوران وہ مجھ سے بھی دہشت گردوں کے اسلحہ خانے کے بارے میں پوچھتا رہا، مگر اس نے بھی مجھے جواب دینے کا موقع نہیں دیا۔ اسی لمحے وہ

شخص جو بڑی عمر کی عورت کو اذیت دے رہا تھا' لڑکی کی طرف مڑا اور بجلی کا تار اس کی شرم گاہ میں ٹھونس دیا۔ لڑکی کا جسم پھڑک کر دوہرا ہو گیا اور بری طرح کانپنے' اینٹھنے لگا۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ جسم اپنے معمول پر واپس آئے' اور پھر اس کی چھاتیوں کی نوک پر بجلی کا تار چھوانے لگا۔

اینا اور ہتھکڑی پہنے ہوئے دونوں قیدی اس اذیت پسند کو چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگے۔ ایک اور محافظ نے ریڈیو کی آواز تیز کر دی۔

"یہاں تمہاری آواز کون سنے گا؟" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

نوجوان نے رونا شروع کر دیا اور اس کی چیخ ریڈیو کی تیز موسیقی سے زیادہ اونچی سنائی دے رہی تھی' "مجھے تم سے محبت ہے' سیسیلیا' تم سے محبت ہے۔"

"اب بہترین حصہ آئے گا" محافظوں میں سے ایک نے اعلان کیا اور فوراً ہی ایک ایک کر کے وہ محافظ اور اذیت رساں آگے اور پیچھے سے ہم سے زبردستی کرنے لگے۔ ان درندوں میں سے ایک نے ایک چکنی' نکیلی لکڑی میرے مقعد میں ڈال دی اور پھر مجھ سے کہنے لگا' "غلیظ رنڈی' بعد میں جب اصل مال ڈالوں گا تب تجھے مزہ آئے گا۔"

اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔

۱۵ جنوری

مر جانے کی ایسی پاگل' زوردار خواہش نے مجھے آلیا۔

۱۶ جنوری

دو دن سے مجھے کھانے کے لیے کچھ نہیں ملا۔ جسمانی تکلیف کا احساس مندمل ہو رہا ہے۔ دو دفعہ مجھے غسل خانے لے کر گئے اور میرا پیشاب جیتا جیتا خون تھا۔ سارے دن میں سوچتی رہی ہوں نیستور کے بارے میں .....

(باب ۶)

میں ایک پریشان کن شک میں مبتلا ہوتا چلا جارہا تھا۔ وہ کاغذ میں نے میز پر گرادیا۔

کھڑکی اور میز کے درمیان دیر تک ٹہلتا رہا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں نیستور کو جانتا ہوں۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن یہ احساس تھا کہ میں سوزانا کو جانتا ہوں۔

میں اسی طرح ٹہلتا رہا، اپنا جی کڑا کرتا رہا، پھر کہیں ہمت ہوئی کہ کاغذ کے اس ٹکڑے کو اٹھالوں۔ میری آنکھوں میں اس کے حروف ناچنے لگے۔

میں پڑھتا رہا:

"سارے دن میں سوچتی رہی ہوں نیستور کے بارے میں...... اور اس کے لمس کے بارے میں۔ ہماری منگنی ہوچکی تھی، پھر بھی میں نے اس سے کہا کہ ذرا صبر کرلے۔ میں اس سے مذاق میں کہا کرتی تھی کہ اس نے اپنے ہاتھ دور نہیں رکھے تو فادر انتونیو سے کہہ دوں گی۔"

اپنا یہ حوالہ دیکھ کر..... اس باریک اور ناہموار تحریر میں اپنا نام دیکھ کر.... میرے حواس سُن ہوکر ہوگئے۔ کچھ دیر لگی پھر مجھے اندازہ ہوا کہ سوزانا کون تھی۔ اچانک ایسا لگا جیسے میری ٹانگیں میرے بدن کا بوجھ نہ سہار سکتی ہوں۔ میں بستر پر گر پڑا۔ اس کاغذ کی عبارت میں نے دوبارہ پڑھی۔ پچھلے کلیسائی حلقے میں' میں سوزانا کے خاندان کا پادری رہا تھا۔

میں وہاں متعین تھا جب وہ چہرے کے مہاسوں کے بارے میں فکرمند ہونے لگی تھی، اور جب تیرہ برس کی عمر میں گرجے آئی تھی، زار و قطار روتی ہوئی، پہلی محبت کے صدمے کا میرے سامنے اعتراف کرنے کے لیے۔ میں اسے

بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں وہاں موجود تھا جب اس نے بیچلرز کی ڈگری حاصل کی۔

ایک دن نیستور سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اسے گرجے لے کر آئی تھی اور میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا تھا کہ "یہ ہیں وہ پادری جو ہماری شادی کرائیں گے۔"

مجھے وہ فوری طور پر اچھا لگا۔ وہ خوش رو نوجوان میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور اس نئی نسل کا فرد جو اردگرد کی چیزوں کو بدل ڈالنا چاہتی ہے' شدت پسندی کا شکار ہوئے بغیر۔ وہ "عفیفہ کے حمل" گرجا گھر میں آنے لگا۔ تھوڑے دنوں کے بعد' میرے لئے مشکل نہ رہا کہ شہر کی کچی بستیوں میں اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے اسے تیار کرلوں۔ ہوشیار نیستور نے میڈیکل کالج کے چند دوستوں کو جمع کرکے رضاکارانہ خدمت کے لئے منظم کیا اور اس کا بلند بانگ نام "عفیفہ کے حمل علاقے کا منصوبہ صحت" رکھا۔

سوزانا بیش تر وقت جھونپڑیوں میں بھاگ دوڑ کرتی رہتی' تیز بخار اور بہتی ہوئی ناک والے بچوں کو ڈھونڈتی رہتی' یا مریضوں کو دیکھنے میں نیستور کا ہاتھ بٹاتی۔ اس کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ ہمارے قلیل سے "بجٹ" کی دیکھ بھال کرتی رہے' جو نقد رقم کے بجائے ان چیزوں پر مشتمل تھا جو شہر کی نسبتاً مال دار علاقون کے دکان داروں نے عطیے کے طور پر دی تھیں۔

آخری دفعہ جب ان دونوں کو دیکھا تھا' مجھے اس طرح یاد ہے جیسے لمحے بھر پہلے کی بات ہو۔ سوزانا' نیستور اور میں' شہر کی ایک بے حد غریب بستی کی جھگی میں کھانا کھا رہے تھے۔

اس سے دن پہلے نیستور میرے ساتھ ایک قریب المرگ بچّے کے سرہانے آیا تھا اور جب میں رسوم و دعا میں مصروف تھا' میں نے اسے آنسو چھپانے کے لیے منہ پھیرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے سوچا تھا' یہ شخص اچھا ڈاکٹر ثابت ہوگا۔ لوگوں کی مصیبت کا عادی ہوتے ہوئے وقت لگتا ہے۔

اس آخری دن ساری صبح نیستور متعدی بیماریوں کے لیے دوا دیتا رہا اور سوزانا ان تھکی ماندی ماؤں کو تسلی دیتی رہی جن کے بچے زیادہ تھے اور کھلانے کو کچھ نہیں۔ ایک غریب خاندان کی جھگی میں دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے، وہ منگنی کی انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھے جن پر سوزانا کے والدین کے گھر ایک سادہ سی تقریب میں، میں نے دعا پڑھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اسے پہناتے وقت سوزانا کی انگوٹھی کی چمک پر میں نے مذاق کیا تھا۔

سوزانا کے بارے میں جان لینے کے بعد اس ڈائری کے بارے میں میرا رویّہ اس طرح بدل گیا کہ میں اس کی تشریح نہیں کرسکتا۔ میں اپنی کلیسائی ذمہ داری کو پہلے سے بھی زیادہ نظرانداز کر رہا ہوں۔ ایک آدھ بار میں نے کوشش کی کہ زبانی درس کا معمول جاری رکھوں۔ میں ڈسپنسری گیا اور مٹی، گارے، دفتی کی ان جھونپڑیوں میں بھی روزانہ جاتا رہا جن کو نئے افسر بلدیات نے، جو فوج کے کپتان تھے اور حکومت کے ''اندر کے آدمی'' تھے، ایک دیوار چنوا کر اس کے پیچھے چھپوا دیا تھا اور یہ اس شہر کی ترقی کے لیے ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔

میری لاپرواہی نمایاں ہوتی جارہی ہے اور حلقے کے لوگ کُھسر پھسر کر رہے ہیں کہ میں ''کاہل'' ہوتا جارہا ہوں۔ میں نے نو بجے والی عبادت معطّل کردی اور ''کیتھولک عمل'' کے لیے خواتین کے ہفتہ وار ڈنر کو ختم کردیا۔

چند دن پہلے مجھے بشپ اوانڈو کی طرف سے ایک خط ملا جس میں میری مزاج پرسی کی گئی تھی۔ وہ مجھے اپنے زیرِ انتظام لینے پر بالکل راضی نہیں تھے۔ میری حیثیت ایک ایسی ناگوار شے کی تھی جس کو انھوں نے مونسینور انتونیلی کے احترام میں برداشت کرلیا۔

ایک دن اس نرم خو افسر بزرگ، مونسینور انتونیلی نے، جس کا احترام گرجا میں ان کے مرتبے سے زیادہ اُن کی انسانی صفات کی بناء پر ہوتا تھا، مجھ سے کہا:

''انتونیو، میرے گلّے کا ایک حصہ، بلکہ میں تو کہوں گا کہ بہترین حصّہ، ان لوگوں کے ہاتھوں برباد ہوا ہے جن کو اقتدار کا نشہ ہے۔ ہم ایسے دور میں جی

رہے ہیں جس میں یہ سوچنا ضروری ہے کہ میمنے کو بھیڑیے سے بچانا بہتر ہے یا سارا زور نیزے پر صرف کر دینا۔ میں سوچ رہا ہوں، انتونیو کہ تمہیں کچھ دنوں کے لیے مقدّس کلیسا کی گھنی چھاؤں میں چھپا دوں۔"

"کس لیے؟"

"تمہارے کام کو تحسین کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔"

مونسینور انتونیلی یہ کہتے رہے کہ غریبوں کے ساتھ میرے کام کو سرکاری حلقوں میں خطرناک نظریات کی ترویج سمجھا گیا ہے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں تو بس ان لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، ان کے دل میں ایمان کا جذبہ بیدار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ جن غیرانسانی حالات میں رہنے پر مجبور ہیں ان کی وجہ سے خدا کے منکر نہ ہو جائیں۔ مونسینور انتونیلی نے مجھ سے کہا کہ گئے وقتوں میں مجھ ایسے پادریوں کو مشنری کہا جاتا تھا۔

اداسی کی گمبھیر کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی جب میرا تبادلہ مونسینور اوانڈو کے پاس کر دیا گیا، جو یہاں سے ایک ہزار میل دور تھا۔ اسقفِ اعلیٰ کی جاری کردہ ایک دستاویز کے مطابق وہ کلیسا کے ان عہدے داروں میں سے تھا، جبر کے سامنے جن کا رویّہ سرِ تسلیم خم کر دینے کا تھا۔

اس کے باوجود میں نے اس تبادلے کی مخالفت نہیں کی۔ مونسینور انتونیلی کو جس وقت سے میں جانتا تھا انہوں نے کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں نہیں کیا تھا اور یہ بات واضح تھی کہ وہ جو کچھ مجھے بتانا مناسب سمجھتے تھے، انہیں اس سے کہیں زیادہ معلوم تھا کہ میری جان کو کیا خطرہ لاحق ہے۔

سو اس طرح میں بوڑھے فادر رامیرو کی جگہ اس دور افتادہ بستی میں آ گیا جس کے چاروں طرف دھوکا دینے والے پہاڑ اور خوبصورت مناظر ہیں جو اس بستی کی غربت کو چھپا نہیں سکتے۔

مجھے یقین ہے کہ مونسینور اوانڈو نے اب تک اپنے افسرِ اعلا سے رابطہ کرکے ان کو ان کے اس شاگرد کی عجیب و غریب حرکات کے بارے میں بتا دیا

ہو گا' اور اس بات سے مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ' مجھے اتنا ہی یقین ہے کہ مونسینور انتونیلی میری ذہنی حالت کو معاف کر دیں گے اگر انہیں اس کے اسباب معلوم ہو جائیں۔ کسی دن ہو بھی جائیں گے۔

میں اس پورے ہفتے را ہبوں کی سی حالت میں رہا ہوں۔ برائے نام کھایا پیا ہے۔ جوانیتا میرے دروازے کے سامنے منتظر رہتی ہے اور مجھے مجبور کرتی ہے کہ صبح سات بجے کی عبادت پر جانے سے پہلے کچھ نہ کچھ منہ میں ڈال لوں۔ میری جسمانی حالت روز بروز کم زور ہوتی جا رہی ہے جوں جوں اس روزنامچے سے میری دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ شدید سردرد اور چکر لاحق ہو گئے ہیں۔ پھر بھی اس ہفتے میں نے زیادہ اندراجات نقل کئے ہیں۔

(باب ۷)

۱۸ جنوری

آج پھر منہ پر نقاب باندھ کر وہ مجھے اسی جگہ لے گئے۔

دھات کے زینے پر چڑھتے ہوئے دبی دبی آوازیں جو مجھے سنائی دے رہی تھیں' دروازہ کھلتے ہی سیلاب بن کر امڈ آئیں۔ ہمارے داخل ہوتے ہی وہ تھم گئیں۔

"یہ پاگل پھر آگئی؟" اسی آواز نے پوچھا جو پچھلی دفعہ مجھ پر چیخی تھی۔ "غلیظ تخریب کار رنڈی" اس نے کہا اور کوئی سخت نکیلی چیز میرے مقعد میں گھسیڑ دی۔

"تمہارے ساتھ ٹھیک رہی' ناراز؟" مجھے جو آدمی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے' ان میں سے ایک نے پوچھا۔ کمرے کے دوسری طرف سے ہنسی پھوٹنے لگی جب کسی اور نے جواب دیا "اسے پہلی دفعہ کنواری ملی ہے۔"

ہنسی اور تیز ہوگئی جب اس نے جواب دیا۔ ''غلیظ رنڈی بے ہوش ہوگئی۔ ایسا لگ رہا تھا لاش کو چ د رہا ہوں۔''

انہوں نے نقاب کھولی تو میں نے دیکھا کہ اینا وہاں تھی مگر وہ نوجوان لڑکی نہیں تھی جسے سیسیلیا کہہ کر پکارا گیا تھا۔ نہ وہ دونوں آدمی تھے۔ مگر بیچ والی مسہری کے ڈھانچے پر ایک اور عورت تھی۔ اس کی عمر پچیس کے قریب ہوگی۔ اس کے جسم کو پھیلا کر اور ٹانگیں کھول کر باندھا گیا تھا اور اس کے سارے بدن پر نیلے نیلے نشان پڑے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ایک آدمی جو ہاتھ میں بجلی کے تار لیے کھڑا تھا، دوسرے سپاہیوں سے پوچھنے لگا کہ سیسیلیا کہاں ہے۔

''وہ ابھی تک چ ئی کے لیے ٹھیک ٹھاک حالت میں تھی، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ لیفٹیننٹ صاحب کو تحفے میں پیش کر دیں۔'' میرے ساتھ آنے والے سپاہیوں میں سے ایک نے جواب دیا۔

پہلی مرتبہ آج انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں سلویا مولی ناری کو جانتی ہوں۔

۱۹ جنوری

اذیت گاہ کے اس پھیرے میں میرے محافظ پہلے سے کہیں زیادہ سفّاکی کا برتاؤ کرتے رہے۔ اینا پہلے سے وہاں موجود تھی اور اس کے ساتھ وہ نئی لڑکی بھی تھی جس کو میں نے کل دیکھا تھا۔ فوجی وردی میں ایک آدمی بھی تھا جسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا، جس کو ہر شخص بڑی عزت کے ساتھ ''لیفٹیننٹ صاحب'' کہہ کر پکار رہا تھا۔

''اچھا، تو تم سلویا کو جانتی ہو؟'' جوں ہی میرا نقاب کھول دیا گیا، اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''وہ کہاں ہے؟''

"مجھے نہیں معلوم۔"

لیفٹیننٹ نے میرے پیٹ میں زور سے مُکّہ مارا' اور میں درد سے دوہری ہوگئی تو اس نے آدمیوں کو حکم دیا کہ میرے کپڑے اتار کر مجھے ننگا کردیں۔ انہوں نے مجھے باندھ دیا اور لیفٹیننٹ کا اشارہ ملتے ہی جو لوگ دوسری عورتوں کو اذیت دے رہے تھے' مجھے بجلی کے جھٹکے دینے لگے اور لیفٹیننٹ مجھ سے پوچھتا رہا'' "سلویا کہاں ہے.... کہاں ہے وہ؟"

میرے نہ جاننے پر اس کا غصّہ بڑھ گیا اور اس نے حکم دیا کہ بجلی کی وولٹیج بڑھادی جائے۔

تیسرے اذیت رساں کو ہدایت دی گئی کہ میرے مسوڑھوں پر بجلی لگائے۔ میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو احساس ہوا کہ ایک آدمی مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کررہا ہے اور مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس کو تسلّی ہوگئی۔

۲۰ جنوری

لیفٹیننٹ وہاں دوبارہ موجود تھا۔ اینا بھی تھی اور وہ دوسری عورت بھی۔ اس بار میں نے بڑی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ وہ دوسری عورت مسکرارہی ہے اور دوستانہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی ہے' اور یہ بات مجھے بہت عجیب معلوم ہوئی۔ بجلی کے جھٹکے لگنے سے اس کا جسم ٹیڑھا ہوگیا مگر وہ مکمل خاموشی کے ساتھ مسکراتی رہی۔

لیفٹیننٹ وہاں آیا جہاں مجھے لٹادیا گیا تھا اور دوبارہ مجھ سے سلویا کے بارے میں پوچھا اور فوراً ہی مجھے کوڑے مارنے لگا۔ اس نے ہیڈ فونز اٹھالیے جو اس نے میرے واسطے منگوائے تھے اور میرے کانوں پر لگادیے۔ مسلسل اونچی آواز نے فوراً ہی مجھے پھر بے ہوشی کی سرحد میں پہنچادیا۔

بعد میں جب آنکھیں کھلیں' تو لیفٹیننٹ مجھ سے سلویا ہی نہیں' بلکہ اس کے دوست کے بارے میں بھی پوچھ رہا تھا۔ وہ غصّے سے لال بھبھوکا ہوگیا جب میں نے کہا' "مجھے نہیں معلوم۔" ایک بار پھر اس نے وحشیانہ طریقے سے مجھے

مارا، پھر کوڑے کا دستہ میرے مقعد میں گھسیڑ دیا۔ میں بے ہوش ہورہی تھی تو میں نے دیکھا کہ وہ کوڑا اپنے کسی ماتحت کی طرف پھینک رہا ہے کہ "اسے دھو کر صاف کر دے۔"

۲۲ جنوری

میں نے اپنے برابر کی کوٹھری کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ میں نے آوازیں سنیں، گھونسے لگنے کی آواز، لیکن کوئی چیخ نہیں، رونے کی کوئی آواز نہیں۔

میں نے تصوّر کیا کہ اس کوٹھری کی عورت مسکرا رہی ہے اور مجھے خیال آیا کہ شاید وہ عورت ان لوگوں میں سے ہو جو اپنی مرضی کے مطابق ایسی ہپناٹک حالت پر پہنچ جاتے ہیں جہاں اعصابی نظام سے درد کا راستہ بند کر دیتے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ پیانو بجانے والے کے بارے میں سنا تھا کہ جس وقت اسے اذیت دی جا رہی تھی وہ اپنے ذہن میں باخ کی موسیقی بجاتا رہا۔ اور ایک سرجن تھا جو تصور ہی تصور میں اپنے جسم کے ان حصوں کو انزتھیزیا سے بے ہوش کر کے سن کرتا رہا جن کو اذیت پہنچائی جا رہی تھی۔ اگلی کوٹھری کی اس لڑکی کے پاس کیا وسائل تھے؟ وہ کیا تصوّر کرتی تھی؟

تقریباً بیس منٹ اور وہ اسے مارتے رہے۔ رونے چیخنے کی کوئی آواز نہ آئی۔

۲۶ جنوری

چار دن ہو گئے مجھے اس اذیت گاہ میں نہیں لے جایا گیا۔ بعد میں، مجھے ایلیشیا کی زبانی معلوم ہوا کہ سکون کے یہ چند دن اس وجہ سے ملتے ہیں کہ ان لوگوں کے پاس نمٹنے کے لیے گنجائش سے زیادہ "گاہک" ہیں۔

سپاہیوں کی مختلف شفٹیں تھیں اور مختلف سپاہیوں کے رویے بھی مختلف تھے۔ بعض ایسے تھے جو مجھے منہ پر نقاب اور ہتھکڑیاں باندھے بغیر رہنے دیتے۔ ایک اور تھا جو میری طرف ہمدردی سے بھی دیکھ لیتا تھا، حالاں کہ وہ کچھ نہیں بولا۔

ایک اور سپاہی ایسا تھا جو مسہری کے ڈھانچے سے میرے ہاتھ پاؤں باندھے

رکھتا اور مجھے کبھی غسل خانے نہیں لے جاتا۔ میں جتنی بھی خود کو روکنے کی کوشش کرتی، آخر میں ہوتا یہی تھا کہ میں گندی ہوجاتی۔ اس پر وہ آگ بگولا ہوجاتا اور مجھے گالیاں دینے کے بعد وہ ٹھنڈے یخ پانی کے پائپ کا رخ میری جانب کردیتا اور میں یوں ہی زنجیر سے بندھی کی بندھی رہتی۔ ان کوٹھریوں کو اس قسم کے واقعات کے لحاظ سے تعمیر کیا گیا تھا کیوں کہ فرش میں ایک سوراخ تھا جس پر لوہے کی جالی ڈھکی ہوئی تھی کہ پانی اور جسم کی گندگی کو بہا دے۔

ایک اور سپاہی کوٹھری میں داخل ہوتا تھا تو صرف میرے جسم کو مسوسنے کے لیے۔ وہ میرے کان میں فحش باتیں کہتا رہتا اور مجھے ٹٹولتے، مسوستے ہوئے کہتا کہ میں نے اس کی بات نہ مانی تو مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ ''کتے کا پلا'، کتے کا پلا'' میں اپنے آپ سے دہراتی رہتی۔

''کتے کا پلا۔'' ایک دن یہ الفاظ منہ سے نکل گئے۔

وہ جنونی اس پر ہنس دیا۔ اس کے ذرا دیر بعد میں نے اپنی چھاتیوں کے درمیان کوئی گرم چیز بہتی ہوئی محسوس کی۔ بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے میرا بدن پونچھ کر صاف کیا، نقاب میرے منہ پر چڑھائی اور کوٹھری کے باہر نکل گیا۔

۲۷ جنوری

آدھی رات کے بعد مجھے کوٹھری سے نکالا گیا اور ایک گاڑی کی طرف لے جایا گیا۔ مجھے گاڑی میں ایک اور عورت کے اوپر گرا دیا گیا، جس کے منہ سے کراہ نکلی۔ میں کوشش کرنے لگی کہ میرا بوجھ اس کے اوپر سے ہٹ جائے تو ایک محافظ کو اندازہ ہوگیا کہ میں کیا کررہی ہوں اور وہ اپنے بوٹوں سے میرا بدن کچلنے لگا۔

اذیت گاہ میں لے جاکر انہوں نے ہمارے چہروں پر بندھی نقاب کھول دی اور مجھے پتہ چلا کہ میری ساتھ وہی لڑکی ہے جو مسکرائی تھی۔ میں نے اپنی نظروں کے ذریعہ اس کو بتانے کی کوشش کی کہ مجھے کس قدر افسوس ہے کہ وہ

گاڑی میں مجھ سے پچھلی گئی۔ اس کی نظر ایسی درد بھری تھی کہ بس۔

ہمیں ننگا کر دیا گیا اور مسہری کے ڈھانچوں سے باندھ دیا گیا۔ تیسرے ڈھانچے سے ایک عورت بندھی ہوئی تھی جسے سات ماہ کا حمل ہو گا۔ میری مسہری کے پاس اور دو سپاہیوں کی نگرانی میں ایک کم عمر سا نوجوان کھڑا تھا جس کے ہاتھ اس کے پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔

"دیکھو، تاکہ تم سیکھ سکو" ایک سپاہی نے اسے حکم دیا۔ پھر وہ برقی تار اس عورت کی شرم گاہ سے چھوانے لگا۔ دوسرے نے بھی اسی طرح کیا اور بجلی کا تار عورت کی چھاتیوں کی نوک پر رکھ دیا۔

جب اس نوجوان نے منہ موڑ لیا کہ اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا تو ایک سپاہی نے اس کی کنپٹی پر بندوق کا دستہ مارا، اور چیخ کر کہا:

"دیکھو تمہاری بیوی تمہاری وجہ سے کیسے تڑپ رہی ہے 'گوریلے' کتے کے پلے!"

سفید بالوں والا ایک آدمی، جسے احترام کے ساتھ "ڈاکٹر مینگیلے" کے نام سے پکارا جا رہا تھا، سفید کوٹ پہنے ہوئے اور گلے میں آلہ ڈالے ہوئے، جتنی دیر اس عورت کو اذیت دی جاتی رہی، اس کی "زندگی کی نشانیاں" دیکھتا رہا، جانچ کرتا رہا۔ اچانک جیسے اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"درندو!" وہ چیخا۔

"کیا ہوا، ڈاکٹر صاحب؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

کوئی جواب دیے بغیر "ڈاکٹر مینگیلے" اس عورت پر جھک گئے اور اس کے چہرے سے آنسو پونچھنے لگے۔ انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا کہ اس کا حال کیا ہے۔ اس سب کے دوران وہ اذیت رسانوں کے دیے ہوئے ایک تار سے چمچہ باندھتے رہے۔ پھر انہوں نے وہ چمچہ عورت کی شرم گاہ کے اندر ڈال دیا، غالباً اس لیے کہ بجلی کا جھٹکا اس کے ہونے والے بچے تک پہنچ سکے۔ دونوں

اذیت رساں بہت غور سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر مینگیلے کے ایک اشارے پر ان میں سے ایک نے کنٹرول پینل پر جاکر کرنٹ کی وولٹیج بڑھادی۔

عورت کے جسم سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ اس کا سارا جسم جھٹکوں کی زد میں آگیا۔ پھر وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔

کچھ ناگواری اور کچھ راضی برضا ہونے کے ملے جلے انداز میں "ڈاکٹر مینگیلے" نے اس کا معائنہ کیا' اور کہا:

"اس دفعہ پھر ضرورت سے زیادہ کام کر دکھایا۔"

نوجوان مسہری کی طرف بھاگا جہاں اس کی بیوی کا جسم ساکت پڑا ہوا تھا اور چیخنے لگا:

"قاتل!"

اسے گردن کے پیچھے پستول کی ایک گولی نے خاموش کردیا جو اس کے محافظوں میں سے ایک نے چلائی تھی۔ وہ میرے اوپر گر پڑا اور اس کا لہو رستا رہا۔ اس کی ایک آنکھ دیدے میں سے نکل کر پھٹ پڑی تھی۔

میں نے کوئی گرم چیز اپنے پیروں پر چپچپائی ہوئی محسوس کی۔ میں بے ہوش ہوگئی۔

جب ہوش آیا تو اذیت رساں اور ڈاکٹر مینگیلے بڑے اطمینان کے ساتھ گفتگو کررہے تھے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کا الزام کس پر ڈالا جائے۔ مینگیلے بڑی پیچیدہ تفصیلات بتارہا تھا کہ بجلی کے کرنٹ سے دل کی رگوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔

مردہ جوڑے کو ہٹادیا گیا۔ اذیت دینے والے اکتائے ہوئے لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک میری مسہری کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"یہ دیوانی بڑی سہولت کے ساتھ بے ہوش ہوگئی۔"

اس کے بعد وہ دوستانہ آنکھوں والی لڑکی کی طرف مڑے۔ میں نے تصور کیا کہ وہ اب بھی مسکرا رہی ہے۔ انہوں نے مجھ پر اپنا عمل جاری رکھا۔ میں نے باخ کی موسیقی ذہن میں لانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ میں بے ہوش ہوجانے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

۳۰ جنوری

کوٹھری کی اندھیری تنہائی میں، جس میں رہتے ہوئے تین دن ہوگئے، میں سوچنے لگی کہ چھ جنوری سے پہلے میری زندگی کیسی تھی۔

میرے والدین شاید ضرورت سے کچھ زیادہ دھیان رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ سے مجھے جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے کہ وہ میرا کتنا خیال کرتے ہیں۔ نیستور کو مجھ سے محبت تھی اور بیس جون کو ہماری شادی ہونا طے تھی۔ دو سال کے اندر مجھے کالج سے ادبیات میں گریجویشن کرلینا تھا۔ میں اس ڈگری کا تصور کیا کرتی جس کو میری امی فریم کرواکر دیوار پر میرے ٹائپ رائٹنگ کے سرٹیفکیٹ اور موسیقی کی اکادمی کی سند کے ساتھ نمایاں طور پر ٹانگ دیں گی۔

یہاں ان حالات میں، میں نے اپنے لیے کچھ کھیل تجویز کئے ہیں کہ میں پاگل ہونے سے بچی رہوں۔ کبھی کبھار مجھے دیئے جانے والے چراہندے سینڈوچز کے سوکھے ٹکڑوں سے شبیہیں بناتی ہوں۔ ایک خاص مکھی کو چن لیتی ہوں اس پورے جھنڈ میں سے جو پیشاب، پاخانے کی بو پر آتا ہے، اور اس کی اڑان کا نظروں ہی نظروں میں پیچھا کرتی ہوں۔ پکڑے جانے اور سزا اٹھانے کے خوف کے باوجود نالی کے پاس کافی وقت گزارتی ہوں جہاں مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہوں اور ہاتھ مار کے ایک دو کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔ لمبی ٹانگوں والی ایک مکڑی کو کھلانا چاہتی ہوں جو کوٹھری کے ایک کونے میں جالا پور رہی ہے۔

مکڑی مجھے پہچاننے لگی ہے، کیوں کہ جیسے ہی میں قریب آتی ہوں وہ تیزی سے جالے کے بیچ میں آجاتی ہے جہاں پر میں عام طور سے اس کے لیے مکھیاں رکھتی ہوں۔ میں نے غور کیا کہ مکڑی کس طرح اپنے شکار کو بے دست و پا

کر دیتی ہے اور میں سوچتی ہوں کہ کہیں یہ وہ مکھی تو نہیں جس کا میں نے نام رکھا تھا۔

تین دن سے وہ سپاہی ڈیوٹی پر ہے جو میرے منہ پر نقاب اور ہاتھوں پر ہتھکڑی باندھے رکھتا ہے۔ میں کھیل نہیں پا رہی۔ میں بس یادوں کی زد میں ہوں۔

سلویا کے لیے میری برہمی بڑھتی جا رہی ہے۔

۳۱ جنوری

اسی عمارت کے ایک کمرے میں مجھے دیوار کے سامنے منہ کر کے کھڑے ہونے پر مجبور کیا گیا۔

پیچھے سے آنے والی درشت آواز نے میرا نام اور پیدائش کا مقام پوچھا۔

"کیا تم سلویا مولی ناری کو جانتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا تمہاری اس سے دوستی تھی؟"

"صرف جان پہچان۔"

"کیا تم جانتی ہو کہ تم یہاں کس لیے ہو؟"

"نہیں۔"

"اس وجہ سے کہ تم ہماری جمہوریت کی بنیادوں کو کمزور کرنے والے تخریب کار دہشت پسندوں کے ہاتھوں میں ایک اور مہرہ ہو۔"

"میں تو نہیں......"

"بکواس بند کرو" اس نے چیخ کر کہا۔"اس غلیظ جنگ میں ہماری بہادر مسلّح افواج نے پختہ ارادہ کر رکھا ہے کہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے اس لیے کہ مغرب کی مسیحی اقدار کو زندہ رکھ سکیں۔"

"لیکن میں تو نہیں....."

"بکواس بند کرو" وہ ایک بار پھر مجھ پر چیخا۔

"میری بات کا جواب دو۔ کیا تمہیں مسلّح افواج سے نفرت ہے؟؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ۔

"کیا تم سلویا مولی ناری کو جانتی ہو؟" وہ پھر سے شروع ہوگیا۔

"ہاں۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"کیا تمہاری اس سے دوستی تھی؟"

"بس جان پہچان۔"

"تم نے اسے آخری مرتبہ کب دیکھا تھا؟"

"جس دن اس نے اپنے دوست کے خطوط مجھے دیے۔"

"کیا تم اس کے دوست کو جانتی تھیں؟"

"نہیں۔"

پوچھ گچھ کرنے والا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے بوٹوں کی ایڑی کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ فوج کا کوئی

اعلا افسر ہے۔

مجھے اسی جگہ پر تین گھنٹے تک کھڑا رکھا گیا۔ آخر کار' مزید سوالات کے بغیر مجھے کوٹھری میں واپس بھیج دیا گیا۔ کوٹھری میں پڑے پڑے اس رات میں نے اپنے ذہن میں سلویا سے آخری ملاقات کے ٹکڑے جوڑنے کی کوشش کی۔

نیستور کو کلّیہ طب کے قریب ہی ایک چھوٹا سا فلیٹ مل گیا تھا۔ میرے والد نے کہا کہ رنگ روغن کے اخراجات وہ ادا کر دیں گے۔ نیستور نے بڑے ادب سے انکار کر دیا اور رات میں اور چھٹی کے دنوں میں خود ہی اس پر رنگ کیا۔ ہم نے قرضے پر فرنیچر لے لیا تھا اور جس دن فرنیچر ملنا تھا' مجھے شادی کا جوڑا پہن کر دیکھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے فلیٹ پر بھی جانا تھا۔

کونے پر مجھے سلویا مل گئی اور ہم دونوں آرام سے ٹہلتے ہوئے درزی کی دکان تک گئے جو چھ گلیوں کے بعد تھی۔ وہ کہنے لگی کہ وہ اپنے بچپن کے ساتھی کو خط لکھتی رہی ہے جو فوج میں سپاہی ہے۔ وہ رازداری برت رہی ہے' اس لیے کہ اس کی ماں کو اس لڑکے کے لکھے ہوئے خطوط مل گئے تھے اور وہ ان دونوں کے تعلقات کو پسند نہیں کرتی۔ پھر میں نے دیکھا کہ خطوط کا پلندہ وہ ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ہے۔

اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے لیے میں ان خطوط کو سنبھال کر رکھ لوں۔

سلویا کو دو سال سے جاننے کے بعد میرے دل میں اس کے لیے ایک طرح کی پسندیدگی تھی' حالاں کہ ہم قریبی دوست نہیں تھے اور ہمارے تعلقات کلاسوں کے بعد قریب کے ایک کیفے میں کبھی کبھار کی گپ شپ تک محدود تھے' اور وہ بھی دوسرے طالب علموں کی موجودگی میں۔

درزی کی دکان سے نکل کر فلیٹ میں آئی اور وہ خطوط بستر کے پاس کی میز کی نچلی دراز میں رکھ دیے۔ مجھے خطوط کے پلندے پر بندھے گلابی ربن سے آتی ہوئی نرم خوش بو یاد آئی۔

اس رات میں نے نیستور کو ان خطوط کے بارے میں بتایا تو وہ میرے

رومانوی رویے کا مذاق اڑانے لگا۔ وہ مسکرایا بھی۔ نیستور ہمیشہ سمجھ جاتا تھا۔

یکم فروری

مسہری کے ڈھانچے سے بندھے بندھے، میں سارا دن اس مکڑی کو جالے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتے دیکھتی رہی۔ پھر سلویا کے ساتھ آخری ملاقات کے بعد والا دن میرے ذہن میں زبردستی گھس آیا۔

۵ / جنوری کی دوپہر میں دیر ہو چکی تھی جب میں نے اپنے فلیٹ میں ٹانگنے کے لیے پردوں پر استری مکمل کی۔ پردوں کے کپڑے اور بال پوائنٹ قلم کی ایک جوڑی کے ساتھ، جو میں نے نیستور کے لیے بطور تحفہ خریدی تھی، میں گھر سے نکلی۔ میں ان کو، جس طرح ایپی فینی کی رات کا دستور ہے، جوتوں کے اس جوڑے میں رکھنا چاہتی تھی جو نیستور نے شادی کے لیے خریدے تھے اور جن کو وہ سونے کے کمرے کی الماری میں رکھتا تھا۔

بلڈنگ کا نگراں لابی میں فرش پر کپڑا پھیر رہا تھا جس وقت میں اندر آئی، اور اس نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ وہ جو کام کر رہا تھا، اس سے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جو مجھے عجیب معلوم ہوا۔

اس کی بداخلاقی کے بارے میں سوچتی ہوئی میں تیسری منزل تک آئی۔ جوں ہی میں نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا، مکمل بے ترتیبی اور انتشار کا منظر میرے سامنے آگیا۔ گدیوں کو کاٹ ڈالا گیا تھا اور ان کے اندر کی روئی سارے فرش پر بکھری ہوئی تھی۔ کافی کی میز کی ٹانگیں توڑ دی گئی تھیں اور ٹوٹے ہوئے شیشے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ چینی کے برتنوں والی الماری کے دروازے قبضوں پر سے اکھاڑ دیے گئے تھے اور سارے برتن غائب تھے۔ ٹی وی اور ٹائپ رائٹر بھی غائب تھے۔ سونے کے کمرے کی گھڑی بھی نہیں تھی اور جس الماری میں نیستور نے اپنی جمع کی ہوئی یادگار چیزیں رکھی تھیں، اسے بھی تہس نہس کر دیا گیا تھا۔ بستر کے پاس والی میزوں کی درازیں الٹ دی گئی تھیں اور گدا فرش پر پڑا ہوا تھا، ایک سرے سے دوسرے تک کٹا ہوا۔

میں بھاگتی ہوئی لابی میں نگراں کے پاس گئی۔

"ہم لٹ گئے! ہم لٹ گئے!" میں نے پریشان ہو کر اس سے کہا۔

پھٹے ہوئے کپڑے کو ٹائلوں پر گھماتے ہوئے اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، مگر اس کے ہاتھ رکے نہیں۔

"اس بلڈنگ میں ہمیں مسئلوں والے لوگ نہیں چاہئیں۔" اس نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تم جانتی ہو میرا مطلب کیا ہے۔"

"نہیں، میں نہیں جانتی۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"وہ کل رات آئے تھے۔"

"کون ہیں وہ؟"

"فوجی دستہ۔"

"فوجی دستہ؟"

وہ کھڑا ہو گیا۔

"میں ایک لفظ اور نہیں کہہ سکتا" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کون سا فوجی دستہ؟" میں نے دہرایا۔

"فوج کے سپاہی" اس نے کہا اور اپنا بازو مجھ سے چھڑانا چاہا۔ میں اسے پکڑے رہی مگر اس کے چہرے کی دہشت دیکھ کر اس پر ترس آ گیا۔

"خدا کے لیے۔" وہ گڑگڑایا۔ "میں اس چکّر میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ میرے

بیوی بچے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم سے بات نہ کروں۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو، مجھے چھوڑ دو۔" وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

میں پاگلوں کی طرح گھر بھاگی۔ میں نیستور کو فون کیا، مگر وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کی ماں نے بتایا کہ اسپتال سے ایمرجنسی کے لیے بلایا گیا ہے۔ فوجی اڈّے پر بغاوت کی کوشش ہوئی تھی اور بہت سی اموات ہوئی ہیں۔

میں نے فادر انتونیو کو فون کیا اور پتہ چلا کہ انہیں اندرونِ ملک سفر پر جانا پڑا ہے اور کسی کو نہیں معلوم وہ کب واپس آئیں گے۔ میں رات گئے تک نیستور کو فون کرتی رہی مگر اس کی ماں کے پاس کوئی اطلاع نہیں تھی۔

پھر ٦ جنوری کا دن آگیا۔

(باب ۸)

آج بشپ اوانڈو کی طرف سے مجھے ایک اور خط ملا۔ انہوں نے مجھ سے التجا کی ہے کہ معمّر افراد کے لیے آرام گھر کے منصوبے پر گفتگو کرنے کے لیے شہر آؤں۔

اس قصبے کو بوڑھوں کے گھر کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ایٹمی تباہی کی۔ جو چند ایک بوڑھے باقی بچے ہیں وہ نہایت ٹھاٹھ سے اپنے بچوں کے ساتھ رہ رہے ہیں اور جو بھی کھلی جگہ ملتی ہے، وہاں دن میں نو، نو گھنٹے "بوچاز" کھیلتے رہتے ہیں۔

بشپ اوانڈو کو یہ نہیں معلوم، مگر انہیں کوئی نہ کوئی بہانہ تو گھڑنا تھا اپنے پاس بلانے کے لیے، تاکہ وہ مجھے میرے کام کے بارے میں ڈانٹ ڈپٹ سکیں۔

میں نے جواب لکھا کہ مختلف فلاحی منصوبوں کو ترقی دینے کی جان توڑ کوشش میں مصروف ہونے کی وجہ سے میں نہایت عاجزانہ طور پر اس گفتگو کو ملتوی

کرنے کا درخواست گزار ہوں تاوقتیکہ یہ منصوبے بہتر طور پر منظم ہوجائیں۔ مجھے شک تھا کہ وہ اس پر یقین نہیں کریں گے، لیکن میں مزید مہلت حاصل کرلینا چاہتا تھا تاکہ اس روزنامچے پر اپنے کام کو مکمل کرلوں۔

اس ہفتے کچھ پیش رفت نہیں ہوئی۔ میں بے خوابی میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ ذرا دیر کو آنکھ لگتی ہے تو ہیولے اور ڈراؤنے خواب مجھے جگا دیتے ہیں--- سوزانا کے بارے میں بھیانک خواب۔

میں پسینے میں شرابور اور دہشت سے چیختا ہوا اٹھ بیٹھتا ہوں۔ دو مرتبہ آنکھ کھلی تو حوانیتا میرا دروازہ پیٹ رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی کہ میں اسے بتادوں کہ آخر کیا ہوا ہے۔ اگلی صبح میں اسے اپنے خوابوں کی کوئی الجھی ہوئی مذہبی تعبیر بتاتا ہوں، جو وہ بربنائے عقیدہ مان لے گی۔ میں نے اسے یہ بات راز رکھنے کے لیے کہا تھا، مگر اب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میری غلطی تھی، کیوں کہ اسی دوپہر ڈاکٹر اورٹیز میری خیریت دریافت کرنے کے لیے آئے۔ ''لاسینٹرل'' کی دکان کے مالک اور کیتھولیک خواتین برائے عمل میں سے ایک خاتون کو بھی، جنہوں نے پہلی بار حوانیتا کی سفارش کی تھی جب میں اس حلقے کو سنبھالنے کے لیے آیا تھا، مجھ پر شک ہوگیا ہے۔

اس روزنامچے کا مجھ پر پوری طرح غلبہ ہے۔

(باب ۹)

۲ فروری

اذیت گاہ میں میری نقاب اتاری گئی تو ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا جس کا دبلا پتلا بدن قصائی کے کنڈے سے ٹنگا ہوا تھا۔ ایک سپاہی چرخی چلارہا تھا جس سے لڑکی کا بدن اوپر نیچے ہوسکتا تھا۔

اذیت دینے والوں میں سے ایک اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ مجھے صرف اس کے چوڑے شانے نظر آرہے تھے جن کے پیچھے لڑکی کا مختصر سا جسم چھپ گیا تھا۔ اس کا بدن بڑی شدّت سے جھولا اور دیوار سے جا ٹکرایا' پھر ہڈّیاں چٹخنے کی ہولناک آواز آئی۔

"آویلا کہاں ہے؟" اذیت دینے والے نے پوچھا اور لڑکی کا جسم اس کی طرف واپس پلٹ کر آیا جیسے کسی تجربے کے دوران کوئی مومی پتلا ہو۔ لڑکی کی آنکھیں ساکت تھیں۔

"آویلا' کہاں ہے وہ؟" اس آدمی نے دہرایا۔

لڑکی نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور اس کے حلق سے بھیانک ہنسی کی آواز نکلی۔ اذیت دینے والے نے گال پر سے تھوک پونچھا۔

"خدا کی لعنتی' رنڈی" اس نے لڑکی کے پیٹ پر مُکّے مارتے ہوئے کہا۔

دروازہ ایک دھکّے کے ساتھ کھلا اور لیفٹیننٹ اندر داخل ہوا۔

وہ بولتے رہے مگر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ لیفٹیننٹ نے پھر رسّی چلانے والے کو اشارہ کیا کہ لڑکی کو اور اوپر کردے۔

لیفٹیننٹ کے ایک اور اشارے پر باقی دونوں باہر گئے اور کئی خالی بوتلیں لے کر واپس آئے جو انہوں نے فرش پر دے ماریں' لڑکی کی ٹانگوں کے نیچے۔

لیفٹیننٹ کے سر کی جنبش پر رسّی چلانے والا لڑکی کو نیچے کرنے لگا۔ لڑکی نے چاہا کہ شیشے کی کرچیوں سے بچنے کے لیے پاؤں اوپر کرلے لیکن صرف سیدھا پیر اٹھا سکی۔

"کیا ہوا؟" لیفٹیننٹ نے اپنے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

"وہ دیوار سے ٹکرا گئی" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

لیفٹیننٹ نے رسّی چلانے والے کو حکم دیا کہ لڑکی کو اور نیچے نہ کرے اور

اس کے قریب آیا' اس کے چہرے پر سے آنسو پونچھے۔

"میں تمھیں علاج کے لیے اسپتال بھیج دوں گا" اس نے بڑی شفقت کے ساتھ لڑکی سے کہا۔

وہ خالی نگاہوں سے تکتی رہی۔

"آویلا کہاں ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔

"آویلا کہاں ہے؟" اس نے صبر کے ساتھ نرم لہجے میں اصرار کیا۔

وہ خاموش رہی۔ لیفٹیننٹ نے لات مار کر شیشے کی کرچیوں کو راستے سے ہٹایا اور لڑکی کے عین سامنے جگہ سنبھال لی۔ اس نے ہاتھ پھیلا لیے' جیسے اس کے کانوں پر چوٹ دینے کے لیے تیار ہو اور پھر سے پوچھا:

"آویلا کہا ہے؟"

جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ہتھیلیوں سے لڑکی کے کانوں پر چوٹ لگائی۔

اس کے منہ سے مختصر لیکن تیز چیخ نکلی۔ وہ بے ہوش ہوگئی۔ لیفٹیننٹ یہی کہے گیا' پھر کچھ اضافی ہدایات دے کر باہر نکل گیا۔ ذار دیر بعد ڈاکٹر مینگیلے اندر آگیا اور روئی لے کر لڑکی کے کانوں سے بہتا ہوا خون پونچھنے لگا۔

۲ فروری

اذیت دینے والوں میں سے ایک آج ڈھٹائی کے ساتھ میرا بدن سہلا کر لطف لینے لگا اور سارے وقت "خطرناک غیر ملکی نظریات" کے بارے میں لیکچر دیتا رہا۔ اس نے اس "اہم فریضے" کا بھی حوالہ دیا جو وہ "ان نظریات کی بیخ کنی کے لیے حکومتی کوشش" میں شریک ہو کر انجام دے رہا ہے۔

اس نے اپنی آواز دھیمی کرلی اور مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں بتانے لگا جو میری عمر کی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ لڑکی دندان ساز بن جائے

کیوں کہ اس کام میں اچھی کمائی ہے، لیکن "وہ تمہاری طرح کی رومانوی خواب دیکھنے والی نکلی" اور میری طرح اس نے ادب پڑھنے کا انتخاب کیا۔

"اچھا" اس نے کہا۔ "تو پھر کیا کیا جاسکتا ہے؟ یہ آج کل کے نوجوان! تم چاہتی ہو کہ کل میں تم کو لا کر دکھاؤں کہ وہ کس طرح کی احمقانہ چیزیں لکھتی ہے؟

دوسرا اذیت رساں یہ ساری گفتگو سن رہا تھا اور وہ بھی کچھ کہنے لگا کہ پولی ٹیکنیک میں اس کے چھوٹے بیٹے کو کیسے نمبر مل رہے تھے کہ اتنے میں لیفٹیننٹ وہاں آن موجود ہوا۔

"کل تم نے دیکھا کہ اس عورت کے ساتھ کیا ہوا جب اس نے میرے سوالات کے جواب دینے سے انکار کیا؟" اس نے میرے بستر کے پاس کھڑے ہو کر سوال کیا۔

"اب سے اس کو "بہری لوئزا" پکارا جائے گا" اذیت دینے والوں میں سے ایک نے کہا۔

لیفٹیننٹ قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور دونوں آدمی اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ وہ ایک ہی سوال مجھ سے بار بار پوچھے جارہا تھا۔ جلد ہی وہ اکتا گیا اور باہر چلا گیا۔ اپنی کوٹھری میں واپس آکر اس رات میں نے پہلی بار کھڑکی کے نیچے کتّے کے پلّے کے بھونکنے کی آواز سنی۔ اس سے مجھے اپنا کتا رولیتو یاد آگیا جو نیستور نے مجھے تحفے کے طور دیا تھا۔ اس کی آواز غم ناک چیخوں کی طرح تھی جو رولیتو کے اس گھر میں پہلے ہفتے کے دوران سارے گھرانے کو رات بھر جگائے رکھتی۔ میں نے اپنے آنسو روکنے چاہے مگر یہ اچانک اور دہلا دینے والا احساس کہ میں یک لخت اور پوری طرح بدی کے سامنے چھوڑ دی گئی ہوں، بہت شدید تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ "ڈاکٹر مینگیلے" کا بھوت بڑی شفقت کے ساتھ لوئزا کے کانوں سے خون پونچھے چلا جارہا ہے۔ یہ خواب پوری طرح بھیانک نہیں تھا۔

۴ فروری

میں اپنے ابّا کی کمی کو بھی اتنا ہی محسوس کرتی ہوں جتنا کہ امی کی کمی کو۔ مجھے پہلے کبھی احساس نہیں ہوا کہ میں ان سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ بعض دفعہ مجھ پر ایک تپ زدہ خواہش حاوی ہوجاتی ہے کہ مجھے اسی طرح لپٹائیں جیسے بچپن میں کیا کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے کبھی اذیت رسانی نہیں دیکھی ہوگی۔ وہ کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ان کے سامنے کسی انسان کو اذیت پہنچائی جائے۔ اس کا مجھے یقین ہے۔

۵ فروری

آج وہ مجھے بدلے ہوئے نظام اوقات کے حساب سے اٹھانے آئے۔ مجھے پتہ ہے اس لیے کہ پچھلے موقعوں پر رات کے پہلے پہر یا صبح سویرے کی خاموشی کا احساس ہوتا تھا۔ آج لیکن سڑکوں پر روزمرہ زندگی کی ہلچل کا احساس ہوا۔

انہوں نے میری نقاب اتاری تو میں نے ایک ننگا آدمی دیکھا جس کے منہ پر بھی نقاب بندھی ہوئی تھی، وہ ایک مسہری پر تھا اور دوسری مسہری پر ایک حاملہ عورت تھی۔

میں ایک آدمی کو برہنگی دیکھ کر شرم سے سرخ ہوگئی۔ مجھے مسہری کے بیچوں بیچ باندھ دیا گیا اور میں جس حد تک اپنا سر اس عورت کی طرف موڑ سکتی تھی، میں نے موڑ لیا۔ میں اس کے غیر معمولی حسن پر دنگ رہ گئی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، مجھے امید ہوئی کہ شاید ہم ایک دوسرے کی ہمت بندھا سکیں۔

ہمیں قید کرنے والے اس آدمی کو بجلی کے جھٹکے دے رہے تھے اور اس دوران اس سے کچھ پوچھ بھی رہے تھے کہ دہشت گرد تنظیم سے، خدا جانے کیا نام تھا اس کا، اس کا کیا رابطہ تھا۔ اس آدمی نے جواب دینے سے انکار کردیا اور سوال پوچھنے والے نے وولٹیج بڑھا دینے کا حکم دے دیا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک کراہ سنی۔ سوال پوچھنے والے نے اپنا

سوال دہرایا اور وہ آدمی پھر بھی خاموش رہا۔

''اسے مجھ پر چھوڑ دو'' ایک اور اذیت رساں نے کہا اور پلاسٹک کی ٹرے اٹھائے مسہری کے پاس پہنچ گیا۔

''کیوں نہ یہ بھی دیکھیں؟'' اس شخص نے پوچھا جس کے سوال کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

''بالکل، نارز، بالکل۔''

دو آدمی آئے اور ہمارے سر زبردستی اس منظر کی طرف موڑ دیے۔

''آنکھیں نہ بند کرنا ورنہ پھر تمہارے اس خوبصورت چہرے پر دو چار گندے نشان چھوڑنے پڑیں گے، پیاری ایلیشیا'' اس آدمی نے کہا جو ایلیشیا کا سر پکڑے ہوئے تھا۔

اس نے چاقو کا پھل ایلیشیا کی گردن پر رکھ کر دبایا اور اس کے سر کے بال پکڑ کر گھسیٹے۔

''یہی تمہارے لیے بھی ہے'' اس آدمی نے کہا جو مجھے نقاب اوڑھے ہوئے ننگے آدمی کی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

جس آدمی نے اس سارے عمل کی ذمّہ داری لے لی تھی، اس نے ٹرے سے استرا اٹھایا اور اس آدمی کے بازو سے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹنے لگا۔ وہ آدمی چیخنے اور تڑپنے لگا۔ اس کے زور سے تڑپنے سے ایک مرتبہ استرا اتنے اندر چلا گیا کہ رگ کٹ گئی ہوگی۔ خون کا فوّارہ نکلا اور اذیت دینے والے کے چہرے کو بھگو گیا۔ ہم پر بھی چھینٹے پڑے۔

جب مجھے ہوش آیا تو اس آدمی کو کمرے سے لے جایا جا چکا تھا اور ایلیشیا بھی بے ہوش پڑی تھی۔ جوں ہی میں نے آنکھیں کھولیں، تو وہ اذیت رساں جو ایک دن پہلے مجھ سے اپنی بیٹی کی نظموں کا ذکر کر رہا تھا، کاغذ کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لیے میری مسہری کے پاس کھڑا تھا۔

"یہ والی جاگ گئی" اس نے کاغذ کے اس ٹکڑے پر سے پڑھتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دے سکتی، میرے مسوڑھوں پر جھٹکا لگا۔

"تم کس علاقے میں آپریشن کرتی ہو؟"

"تمہارے ذمے کون سے "کواڈراز" ہیں؟"

ان میں سے کسی بھی جملے کا میرے لیے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی، تو ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ اس دن وہ جواب سن بھی نہیں رہے تھے۔ سوال پڑھنے کا نگراں وقفہ مانگنے لگا اور اس نے پیچھے کی جیب سے کاغذ کا ایک اور ٹکڑا نکالا۔

"یہ میری بیٹی کی نظمیں ہیں" اس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا۔ "میں انہیں تمہارے اسکرٹ کی جیب میں رکھے دیتا ہوں۔ کل مجھے بتانا کہ تمہیں کیسی لگیں۔"

اس دوران ایلیشیا ہوش میں آگئی اور وہ اس کی مسہری کی طرف چلے گئے۔

ایک اذیت رساں حاملہ عورت کے پیٹ پر "پیکانا" گھمانے لگا اور بچوں کی سی آواز نکال کر گانے لگا:

"دیکھو حوان سیتو کیسے ہلتا ہے...... دیکھو حوان سیتو کیسے ہلتا ہے۔"

باقی لوگ اس کورس میں شامل ہوگئے اور تالیاں بجانے لگے، اور ذرا ذرا دیر کے بعد اس عورت کے پیٹ کو چھوکر دیکھ لیتے کہ اس کا بچّہ پھڑک رہا ہے کہ نہیں۔

"بند کرو یہ گوبر!" لیفٹیننٹ نے کمرے کے اندر داخل ہوئے چیخ کر کہا۔

اذیت رساں حیران ہو کر اپنے افسر کی طرف دیکھنے لگے، جس نے انہیں کمرے کے دوسرے کونے پر جمع کرلیا۔ وہاں آپس میں کچھ بات چیت ہوئی اور

زا دیر بعد ہمیں واپس کوٹھریوں میں پہنچا دیا گیا۔

کوٹھری میں واپس آکر میں نے دوبارہ سے ایک پِلّے کی غم ناک چیخیں سنیں۔

(باب ۱۰)

کل رات میں سوتے سے اٹھ بیٹھا اور میری آنکھیں خود بخود میرے چاروں طرف خون تلاش کرنے لگیں، اور تکیے پر ایک دھبّہ دیکھ کر میں نے اسے چھوا تو پتہ چلا کہ وہ میرے پسینے کی نمی تھی۔

میز پر رکھی گھڑی میں وقت دیکھنے کے لیے کروٹ لی تو ٹانگ میں درد کی ایسی ٹیس اٹھی کہ بس۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا کہ ٹوٹ تو نہیں گئی۔ میرے آنسو بہنے لگے۔

یہ سب پاگل پن ہے۔ اندرون ملک کسی دور دراز حلقے میں دو پادری قتل کردیے گئے اور ان کی ماتمی تقریر میں بشپ نے خیال ظاہر کیا کہ کلیسا کا منصب سختی کے ساتھ صرف اور صرف تبلیغ ہونا چاہیے۔ انہوں نے مزید چند الفاظ ''ہماری مسلح افواج کے نظم وضبط'' اور ''ہمارے آقا یسوع مسیحؑ کے فرمودات سے مطابقت نہ رکھنے والے غیر ملکی نظریات'' کے بارے میں بھی کہے۔ انہوں نے ''خدا کی حفاظت'' میں ہونے کے بارے میں بھی کوئی بات کی۔

الفاظ احتیاط کے ساتھ چنے گئے تھے مگر فی الاصل یہ انتباہ تھا ہم ایسوں کے لیے جو سمجھتے ہیں کہ ہماری راہبانہ ذمّہ داری کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے عملی طور پر کچھ کریں۔ جن ماؤں کے بیٹے غائب کردیے گئے ہیں، ان کے ساتھ مارچ کرنا حکومت کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرنا ہے۔

اگلے دن صبح سات بجے کی عبادت میں، میں نے اپنے خطبے میں ہمارے ملک

میں پہلی بدعنوانی کا بھی ایک آدھ بار ذکر کیا۔ میں نے جبر کا ذکر کیا۔

عبادت کے لیے آنے والے بے چین ہوگئے۔ جب میں نے ''غائب کر دیے جانے'' والوں کا نام لیا تو ہر ایک نے مڑکر پولیس کمشنر اور فوج کے کپتان کی طرف دیکھا۔

دونوں اشخاص ساکت بیٹھے میری طرف دیکھتے رہے اور عبادت ختم ہو جانے کے بعد میری طرف آئے۔

سوائے روزا ارکوئیا اور ایک عورت کے، جس کا چہرہ جھرّیوں بھرا تھا اور جسے میں نے شہر کے گرد و نواح کی غریب بستیوں کا دورہ کرنے کے دوران دیکھا تھا، سب ہی لوگ گرجا گھر سے جلدی جلدی باہر نکل گئے۔

کپتان اور پولیس کمشنر ان عورتوں کو گھورتے رہے، جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کو نکل جانے کے لیے کہہ رہے ہوں، مگر دونوں میں سے کوئی بھی لکڑی کے بنچوں پر سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''میری بیوی کی اور میری بڑی عزت افزائی ہوگی اگر آپ کل رات کھانا ہمارے ساتھ کھائیں'' کپتان نے مجھ سے کہا۔

''مجھے بہت خوشی ہوگی'' میں نے جواب دیا اور کوشش کرکے مسکرا بھی دیا۔ ''لیکن میں نے پہلے سے روزا کی دعوت قبول کر رکھی ہے۔'' میں نے اس عورت کی طرف اشارہ کیا۔

روزا کچھ حیران سی نظر آئی۔ وہ عبادت کے لیے آئی تھی تو میری اس سے سرسری سلام دعا ہوئی تھی اور میں اس کے بارے میں بس یہ جانتا تھا کہ وہ استانی تھی اور اپنے شوہر کی لیبر یونین سرگرمیوں کی وجہ سے اسے بر طرف کر دیا گیا تھا۔

''تو اس کے اگلے دن کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' کپتان نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک'' میں نے اخلاق کے ساتھ جواب دیا۔

دونوں اشخاص خاموشی کے ساتھ باہر جاتے ہوئے ان عورتوں کو یکسر نظر انداز کر رہے تھے۔

میں نے روزا سے معذرت کی کہ اس کا نام استعمال کیا مگر مجھے ان دو دنوں کی ضرورت تھی تاکہ کچھ کام ختم کر سکوں۔ وہ مایوس ہوگئی۔

''کیا میں اتنی غریب ہوں کہ ایک وقت آپ کو اپنی میز پر نہیں بلا سکتی؟'' اس نے پوچھا۔ اس کی ذہانت واضح تھی۔ میں نے آنے کا وعدہ کر لیا۔

کمرے میں واپس پہنچ کر، میں نے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی۔

(باب ۱۱)

۶ فروری

پہلا سپاہی جو میری کوٹھری میں اس وقت آیا جسے میں رات سمجھ رہی ہوں، وہی جنسی جنونی تھا، جو حسب معمول نوچا کھسوٹی اور فحش باتوں کے بعد میری چھاتیوں پر ایک بار پھر انزال کرتا رہا۔

''تاکہ تمہیں اندازہ ہو جائے کہ میں اصل میں برا نہیں ہوں، میں تمہارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں'' اس نے چاؤ سے کہا اور میرے سینے پر سے منی پونچھتا رہا۔

جانے سے پہلے اس نے ڈبل روٹی کا ٹکڑا میرے الٹے ہاتھ میں رکھ دیا اور میری انگلیاں اس کے گرد کس کر بند کر دیں۔

جوں ہی قفل بند ہونے کی آواز آئی میں نے انگلیوں سے ڈبل روٹی گرا دی۔ ایک پھر بے حس و حرکت رہنے اور تاریکی کے کئی گھنٹے سہنے پڑے۔

شفٹ پر آنے والے اگلے سپاہی صفائی والے تھے۔ انہوں نے ٹھنڈے پانی کے پائپ سے فرش دھویا' پھر اس کا رخ میری جانب کر دیا۔ ٹھنڈے یخ پانی کے فوری صدمے کے بعد میں اس غسل کے لیے ان کی ممنون تھی۔ انہوں نے مجھے کھولا' نقاب اتاری اور باہر چلے گئے۔

میں نے پتہ چلایا کہ مسہری کے ڈھانچے سے کان لگا کر' ارتعاش کی شدت سے میں یہ اندازہ لگا سکتی ہوں کہ سپاہی کس وقت برآمدے میں موجود ہیں۔ جب مجھے کسی قدر حفاظت کا احساس ہوا تو میں نے اٹھنا چاہا۔ میری ٹانگیں اتنی سن ہوگئی تھی کہ میں کھڑی نہیں ہوسکی۔ چند قدم چلنے کے قابل ہوئی تو جیسے آزادی کا ایک سرشار جذبہ مجھ پر چھا گیا۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ برآمدے میں موجود سپاہی میری کوٹھری کی طرف آنے کے بجائے اب غسل خانے کی سمت ہیں' تو میں ڈبل روٹی کا وہ ٹکڑا ڈھونڈنے لگی۔ وہ مجھے ملا تو نرم لجلجا ڈھیر بنا ہوا نالی کے پاس پڑا تھا۔ میں نے اس پر دعوت اڑاتی مکھیاں اڑائیں اور اسے اس طرح دبایا کہ جیسے وہ اسفنج ہو۔ اس میں جو بچ گیا وہ میں نے مزے لے لے کر کھایا۔ میری بھوک ختم ہوگئی۔

میں اپنے آپ کو بالکل ٹھیک محسوس کرنے لگی تھی کہ میں نے صحن میں کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔

کوٹھری کی پتلی سی کھڑکی کی سلاخوں میں سے میں نے جھانک کر دیکھا کہ ایک آدمی صحن کے وسط میں کھمبے سے بندھا ہوا ہے۔ اس کے قریب ایک اور آدمی زمین میں گڑی نوک دار کیلوں سے بندھا ہوا تھا۔

دونوں ننگے تھے اور ان کے جسم خراشوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ خوب تیز چمکدار دھوپ تھی اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دونوں صبح سویرے سے وہاں ہوں گے کیوں کہ زمین پر پڑے ہوئے آدمی کی کھال پر دھوپ سے جل جانے کے آبلے پڑے ہوئے تھے۔

قریب ہی ایک سپاہی تربوز کے بیج تھوک کر جی بہلا رہا تھا۔

کھمبے سے بندھا ہوا آدمی مایوسی کے ساتھ تربوز کو تکے جا رہا تھا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہر بیج کی پرواز کا تعاقب کرتا یہاں تک کہ وہ زمین پر گرے ہوئے آدمی کے اوپر جا پڑتا۔ اس کی نظروں سے واقف' وہ سپاہی اگلا بیج ہوا میں اور اونچا تھوکتا اور منہ سے ہوائی جہاز کے اترنے کی آواز نکالتا۔

میں نے اپنے کوٹھری کا دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سنی۔ اس سے پہلے کہ میں سمجھ پاتی' دو سپاہی کوٹھری کے اندر کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے میرے پچھائے پر اس زور سے لات ماری کہ میں دیوار سے جا ٹکرائی اور فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

انہوں نے پھر مجھے مسہری سے باندھ دیا اور مارتے رہے یہاں تک کہ میں بے ہوش ہوگئی۔ آنکھ کھلی تو منہ پر نقاب بندھی ہوئی تھی۔ باہر سے وہی آواز آرہی تھی جسے میں کتّے کے پلّے کی آواز سمجھی۔

۷ فروری

جب مجھے غسل خانے لے جایا جا رہا تھا تو میں نے دوبارہ سے ان ہی مہربان آنکھوں کو برابر والی کوٹھری کے روزن سے جھانکتے ہوئے پایا۔

کوٹھری میں واپس آئی تو پتہ چلا کہ یہ روزن بند کر دیا گیا ہے اور مسہری پر لیٹے رہنے کے حکم کی کچھ دیر اطاعت کے بعد میں دوبارہ کھڑکی پر چلی آئی۔

صحن میں کل جس جگہ ایک آدمی کو زمین سے باندھا گیا تھا وہاں آج خون کا ایک دھبہ تھا۔ دوسرا آدمی اسی طرح کھمبے سے بندھا ہوا تھا۔ وہ اب دبلا لگ رہا تھا اور اس کے بھی سارے بدن پر آبلے تھے۔

ایک جرمن شیپرڈ کتّا اس کے قریب آیا' بھونکنے اور دانت نکالنے لگا تو پیچھے سے ایک آواز نے اس جانور کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ حالاں کہ میں یہ جانتی تھی کہ اس وقت ناممکن ہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہو' میں پھر بھی کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔ جلد ہی دو آدمی آئے' شہری لباس میں لیکن ایک ہی جیسے سیاہ بوٹ پہنے ہوئے اور کھمبے کے پاس رک گئے۔

وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے جو کم عمر تھا وہ قیدی کی زنجیر کھولنے لگا۔ وہ کیا کہہ رہے تھے، میں سن نہیں سکتی تھی۔ اس کم عمر آدمی نے قیدی کی کمر کے گرد ایک رسّی باندھ دی اور اس سے چلنے کے لیے کہا یہاں تک کہ رسّی، جس کا دوسرا سرا چابک والا آدمی پکڑے ہوئے تھا، تن گئی۔

"بھاگو!" اس نے قیدی کو اس زوردار دھکّے کے ساتھ حکم دیا کہ وہ گر پڑا اور اس کے گرنے سے گرد کا ایک بادل اٹھا۔

"بھاگو!" وہ پھر سے چیخا اور اس کے بال پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔

قیدی لڑکھڑاتا ہوا چند قدم چلا۔

"اور تیز!" چابک والے نے چیخ کر کہا۔ قیدی کی رفتار تیز ہو گئی۔

چابک والے نے اس کی پیٹھ پر چابک لہرایا۔ وہ آدمی دائرے میں دوڑتا ہوا ان کے پاس سے گزرتا تو پہلا آدمی اس کے لات مارتا۔ اس پر اس قدر چابک برسائے گئے کہ اس کا خون بہنے لگا۔

۸ جنوری

آج میرے چہرے پر سے نقاب کھولی گئی تو میں نے اپنے آپ کو پچھلے والے سے زیادہ بڑے کمرے میں پایا۔ اس کے وسط میں بچّوں کے لیے بنائے جانے والے اندرونی تالاب کی طرح کوئی چیز تھی، مگر اس زیادہ گہری۔ چھت سے چرخی لٹک رہی تھی۔ رسّی سے قصائی کا آنکڑا بندھا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ الماریاں تھیں جن سے دو آدمی دیوار کی طرف منہ کیے ہوئے بندھے تھے۔

مجھے ان کی طرف دھکیل دیا گیا اور ان میں سے جو نسبتاً عمر رسیدہ تھا اس کے قریب بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ اس آدمی کی عمر تیس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے اور پر اداسی لیکن ٹھہراؤ کا تاثر تھا۔ مجھے اس کے لیے انسیت سی محسوس ہوئی، نہ جانے کیوں۔

اس کے پاؤں سے بھاری بیڑیاں بندھی ہوئی تھی اور سپاہی نے مدد کی تب

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور چلا۔ سپاہی نے اس کو ٹنگڑی مار دی اور وہ پختہ فرش پر گر پڑا لیکن اس نے آواز نہ نکالی۔ فوراً ہی دوسرے اذیت رساں نے تصابی کے آنکڑے کے ذریعے اس آدمی کو اس کی ٹانگوں کی بیڑیوں کی مدد سے اوپر اٹھالیا جیسے وہ آدمی نہ ہو بکرے کی ران ہو۔

وہ آدمی تالاب کے اوپر الٹا لٹکا ہوا تھا اور اذیت رساں انتظار کرتے رہے کہ اس کا بدن جھولنا بند کر دے تو اس سے فوجی ہیڈ کوارٹر پر حملے کے بارے میں سوال کریں۔ وہ آدمی خاموش رہا۔ پندرہ سے لے کر بیس منٹ بعد' اس کا چہرہ سارے بدن کے سمٹتے ہوئے خون کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔

جو اذیت رساں اس تفتیش کا نگراں معلوم ہو رہا تھا' اس نے چرخی چلانے والے کو اشارہ کیا کہ اس کا بدن آہستہ آہستہ نیچے اتارنے لگے۔ اس آدمی نے بدن کے سارے پٹھے اکڑا لیے کہ پانی سے تصادم کو کچھ دیر کے لیے مؤخر کرلے۔ اذیت رساں نے اپنی انگلیوں کے درمیان سے رسی پھسلنے دی اور اس آدمی کا سر پانی میں ڈوب گیا۔

غوطے کے دوران اس نے بہت پاؤں چلائے۔ جب اس کی حرکت رک جاتی تو جو نگراں تھا وہ دوبارہ اشارہ کرتا اور اسے اوپر کھینچ لیا جاتا۔ جوں ہی اس کا سر پانی سے باہر آتا' اس سے پھر وہی سوال کیا جاتا' فوجی ہیڈ کوارٹرز پر حملے کے بارے میں' اور پھر وہ خاموش رہتا۔

اس آدمی کے ساتھ یہ عمل دہرایا جاتا رہا یہاں تک کہ اس میں سے زندگی کے سب آثار ختم ہو گئے۔ تب اسے زمین پر اتار دیا گیا اور ایک اذیت رساں کمرے سے باہر گیا اور اپنے ساتھ معزز نظر آنے والے ایک آدمی کو لے کر آیا جس کی گردن سے اسٹھیتواسکوپ جھول رہا تھا۔

اس نے قیدی کو یوں دیکھا جیسے اُکتا چکا ہو۔

"آج کے لیے کافی ہے" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔ قیدی کے جسم کو گھسیٹ کر کمرے کے باہر لے جایا گیا۔

سب چلے گئے سوائے ایک سپاہی کے جو رسالہ پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ میری اور دوسرے قیدی کی طرف دیکھ لیتا۔ میں اپنی آنتوں کی حرکت کو روک نہ سکی۔

"حوض کی طرف!" نگراں نے دوبارہ کمرے میں آتے ہی کہا۔

دو آدمیوں نے مجھے پکڑلیا اور ٹھنڈے پانی کے حوض میں گرادیا۔ میرے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے اور میں حوض کی تہ میں پہنچ گئی اور پھرایک مدت کے بعد' جو صدیوں پر محیط تھی' بال پکڑ کراوپر گھسیٹا گیا۔

"اب صاف ستھری ہوگئی" ایک آدمی نے کہا۔

"آنکڑے سے باندھ دو!"

دوبارہ ہوش آیا تو کوٹھری میں تھی' منہ پر نقاب بندھا ہوا اور ہاتھ پاؤں مسہری سے بندھے ہوئے۔ میں یوں ہی کروٹیں بدلتی رہی تاکہ اپنے آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ میں نے دوبارہ رولیتو کے بھونکنے کی آواز سنی۔ مجھے پتہ ہے وہ رولیتو ہے۔

(باب ۱۲)

آج پھر میں سر کے بھیانک درد کے ساتھ اٹھا۔ عبادت کے دوران اندازہ ہوا کہ لوگوں کی حاضری بہت کم ہوگئی ہے اور جو چند ایک لوگ بڑی ہمت کرکے خداوند خدا کی تقدیس کے لیے یہاں جمع ہیں' عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

کپتان اور پولیس کمشنر غیر حاضر ہیں۔ روزا اور وہ جھرّیوں بھرے چہرے والی عورت اپنی مخصوص جگہوں پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے آس پاس' شہر کے غریب بستیوں کے کئی لوگ ہیں جنہیں میں نے اس سے پہلے گرجا گھر نہیں دیکھا

تھا۔

پھٹے پرانے کپڑوں میں ان قابل رحم عورتوں اور داڑھی بڑھائے ہوئے مردوں کی وجہ سے ' اگلی نشستوں پر بیٹھے والی خواتین میں کچھ بے چینی سی ہے اور ان کے تاثرات دیکھ کر میں سوچتا ہوں کہ آئندہ کسی موقعے پر ''خدا کے حضور مساوات'' پر وعظ کہوں گا۔

عبادت کے بعد روزا یاد دلانے کے لیے آئی کہ مجھے اس کے گھر کھانے پر جانا ہے۔ اس کو تسلی دینے کے بعد کہ میں مقررہ وقت پر آجاؤں گا' میں کمرے میں آگیا اور روزنامچہ نقل کرتا رہا۔

دوپہر کے قریب' میرا سر درد کے مارے پھٹا جارہا تھا اور میں نے حوانیتا کے اصرار کے آگے سر جھکا دیا اور دو گھنٹے کے لیے کام میں وقفہ کردیا۔ میں کھانا کھا رہا تھا تو وہ اصرار کرنے لگی کہ میں روزا کے گھر نہ جاؤں۔ یہ سوچ کر کہ وہ مجھ پر جاسوسی کرتی آئی ہے' میں ناراض ہونے لگا۔

''تمہیں کیسے پتہ کہ میں آج روزا کے گھر جاؤں گا؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''ساری بستی یہی باتیں کررہی ہے' فادر'' اس نے فرش پر نظریں جھکا کر کہا۔

روزا کی عمر پینتالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی' وہ دلکش عورت تھی اور اب اکیلی بھی تھی۔ اس کے بارے میں جو تھوڑا بہت سن رکھا تھا' اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس وقت سے اکیلی رہ رہی ہے جب دو سال پہلے اس کے شوہر کا پراسرار حالات میں انتقال ہوگیا۔ اس جیسے چھوٹے قصبے میں' ایسے واقعات لوگوں کے باتیں بنانے کے لیے کافی تھے۔ پھر بھی میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔

سورج ڈھلے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ میں روزا کے گھر پہنچا۔ کھڑکی میں روشنی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی' تو میں نے دیکھا کہ سڑک کے

دوسری طرف دو سائے حرکت میں ہیں۔ میرا شبہ کہ میری نگرانی کی جارہی ہے، رفع ہوگیا جب مجھے یاد آیا کہ اس قسم کے چھوٹے قصبوں میں عاشق معشوق تاریکی کے پردے میں ملا کرتے ہیں۔

روزا نے دروازہ کھولا اور مجھے لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں آگئی جہاں اطمینان سے بیٹھنے کے لیے کہہ کر میز لگانے چلی گئی۔ میں اس دوران ان بے تماشا تصویروں کو دیکھتا رہا جو کمرے کی ہر دیوار پر لگی ہوئی تھی۔ زیادہ تر تصویریں ایک آدمی کی تھیں جس کے بارے میں، میں نے قیاس کیا کہ یہ روزا کا شوہر ہوگا۔

اسے بہت محبّت رہی ہوگی اپنے شوہر سے، کیوں کہ تصویریں اس کی پوری زندگی کا احاطہ کررہی تھیں۔

"کھانا تیار ہے، فادر" اچانک پیچھے سے روزا کی آواز آئی۔

"میں آپ کے شوہر کی تصویریں دیکھ رہا تھا" میں نے اس بچّے کی طرح کہا جسے شرارت کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔

"شوہر اور بیٹا" اس نے جواب دیا۔

"آپ کا بیٹا؟"

"ان دونوں میں تل برابر فرق نہ تھا، فادر۔"

"مجھے یہ تو معلوم تھا کہ آپ کے شوہر فوت ہوچکے ہیں، لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ کا بیٹا بھی ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ روزا کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔

"وہ ان دونوں کو مجھ سے دور لے گئے۔ انھوں نے ان دونوں کو مار ڈالا، فادر۔"

میں نے نہیں پوچھا کہ وہ کون تھے۔ اس لیے کہ مجھے معلوم تھا۔ میں نے

اس کا بازو تھاما اور اسے ان دو پرانی دھرانی آرام کرسیوں میں سے ایک پر سہارا دے کر بٹھا دیا' جو اس کمرے کا کل سامان تھیں۔

"آپ اس کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہیں؟"

"کھانا' فادر۔"

روزا نے تھوڑی دیر کے بعد مجھے بتایا کہ اس کا شوہر جہاں کام کرتا تھا' یونین کے اس دفتر سے باہر نکلنے کے تھوڑی دیر بعد حادثے کا شکار ہو کر مرگیا تو ایک جیپ جس میں تین آدمی بیٹھے تھے' ان کے گھر کے دروازے پر آکر رک گئی۔ ان میں دو باہر نکلے اور اپنی شناخت کروائی کہ فوج کے آدمی ہیں۔

اس نے دروازہ کھولا تو وہ اس پر پل پڑے اسے مار مار کر زمین پر گرا دیا اور سیدھے اس کے بیٹے کے کمرے میں گھس گئے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر اسے گھسیٹتے ہوئے باہر نکالا۔ ہتھکڑی پہنائی اور جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد جس جس سرکاری دفتر میں ممکن تھا' روزا وہاں گئی' معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی' لیکن سوائے جھوٹ کے اسے کچھ نہ ملا۔ اس کے بعد اسے کوئی خبر نہ ملی۔ یہاں تک کہ ایک سرکاری افسر نے' فادر رومیرو کے توسّط سے اطلاع دی کہ اس کا بیٹا سرحدی فوج کے ساتھ مقابلے میں ہلاک ہو گیا۔

مبیّنہ طور پر اسی مقابلے میں ماریا آرسے کا چھوٹا بیٹا بھی ہلاک ہوا۔ یہ وہی عورت تھی جسے گرجا گھر میں روزا کے ساتھ دیکھا تھا۔ روزا لڑکے کی لاش تک نہ دیکھ پائی۔

"ان دو ماہ میں فادر رومیرو نے کیا کیا؟" میں نے اپنے آپ کو یہ سوال کرتے ہوئے سنا حالاں کہ میں اس سوال کے محرک سے صحیح معنوں میں باخبر نہیں تھا۔

"وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے' بوڑھے اور جوڑوں کے درد کے مارے ہوئے ہونے کی وجہ سے' کہ بشپ اوانڈو سے ہماری ملاقات کرا دیں۔"

"بشپ اوانڈو؟" میں نے اعتبار نہ کرتے ہوئے دہرایا۔ میں مزید تبصرہ کا منتظر تھا مگر روزا خاموش رہی۔

"بشپ اوانڈو نے آپ دونوں سے کیا کہا؟"

روزا میری طرف تکے گئی۔

"فادر، میں آپ کو جو کچھ بتا رہی ہوں اسے میرے ایمان کی کمزوری مت سمجھیے گا۔ آپ مختلف ہیں۔ مجھے پتہ ہے آپ مختلف ہیں ورنہ آپ وہ سب نہ کہتے جو آپ نے اس دن ان کے سامنے وعظ میں کہہ دیا۔"

"بشپ اوانڈز نے کیا کہا؟" میں نے نرمی سے دہرایا۔

"اگر تم دونوں نے یہ سیکھا ہوتا کہ کلیسا کے تعلیم کردہ مسیحی اصولوں کی روشنی میں اپنے بچوں کی پرورش کیسے کرو، تو آج وہ بچّے تمہارے ساتھ ہوتے۔"

"یہ سچ نہیں ہوسکتا" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں فادر، انہوں نے یہی کہا۔ انہوں نے بالکل یہی الفاظ کہے" وہ آہستہ سے بولی۔

ہم نے کھانے کی چیزوں میں سے کچھ نہیں کھایا۔

جانے سے پہلے روزا نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں جلد ہی کھانے کے لیے دوبارہ آؤں گا۔ میں نے کہا ضرور، اور وہ اس سے خوش ہوگئی۔

روزا کے گھر سے ایک گلی آگے جاکر میں رونے لگا۔ باقی ساری رات میں نے آپ کو کمرے میں بند کرلیا، اور صبح کی پہلی کرنوں نے مجھے ان اندراجات پر کام کرتے ہوئے پایا:

(باب ۱۳)

۹ فروری

میں پہچان گئی کہ برآمدے کی وہی مانوس طوالت ہے، شیشیوں کی وہی آوازیں اور وہی بو۔ اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ نابیناؤں کی دوسری کوئی نہ کوئی حس کیسے تیز ہو جاتی ہے۔

جب انہوں نے میرا نقاب اتارا تو سب سے پہلے نظر جس پر پڑی، وہی عورت تھی جس کا نام لوئزا تھا۔ اسے ایک مسہری سے باندھا گیا تھا، اس کی الٹی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور سر پر ایک کام چلاؤ قسم کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دیوار کے قریب وہی آدمی تھا جسے گزشتہ دن حوض میں اذیت دی گئی تھی۔ وہ ننگا تھا اور اس کے ہاتھوں میں بیڑیاں پہنا دی گئی تھیں جو اس کے ٹخنوں پر بندھی ہوئی تھی اور یوں وہ ماں کے رحم کے اندر بچے کی سی حالت میں رہنے پر مجبور تھا۔ ایک اور مسہری سے مجھے باندھ دیا گیا۔ لیفٹیننٹ نے اس آدمی سے ایک فوجی اڈے پر حملے کے بارے میں پوچھا۔ اس آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا تو لیفٹیننٹ ایک ایک کر کے کئی نام پکارنے لگا۔ قیدی خاموش رہا۔ لیفٹیننٹ بے صبری کا مظاہرہ کرنے لگا۔ ہر نام پکارتے ہوئے وہ قیدی کے تمام بدن پر لاتیں برسانے لگا۔ اسے قیدی کی طرف سے کراہوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا اور وہ باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد لیفٹیننٹ واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں موٹر میں ڈالنے والے تیل کی ڈبّی تھی اور دوسرے ہاتھ میں کاغذ کی تھیلی۔ تھیلی میں سے عجیب سی چیں چیں اور کھر کھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

لیفٹیننٹ کے ساتھ ایک آدمی اور تھا جسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا اور جس کے ہاتھوں میں ٹانکا لگانے والی دھونکنی اور کوئی کوئی اٹھارہ انچ کے قریب

دھات کی سلاخ تھی۔

مجھے اذیت پہنچانے والوں کو یقیناً ان سب چیزوں کا مقصد معلوم تھا، اس لیے کہ وہ فوراً لیفٹیننٹ کے ساتھ ہوگئے اور ان بچوں کی طرح بن گئے جن کو نئے کھلونے ملے ہوں۔ وہ قیدی کے پاس گئے اور اسے بیچ کی مسہری پر لے آئے۔ اسے رسیوں اور زنجیروں سے اس تختی کے ساتھ جکڑ دیا گیا کہ اس کی پشت دوہری ہو کر کمان بن گئی۔

"مجھے پتہ ہے تو اب بولے گا، کُتیا کے پِلّے" لیفٹیننٹ نے زیر لب کہتے ہوئے اس کپّی کے اندر سوراخ کر دیا۔ دوسرے آدمی نے اسے دھات کی سلاخ پکڑائی، جس سے لیفٹیننٹ نے اندازہ کیا کہ وہ سوراخ میں آسانی کے ساتھ جاسکتی ہے۔

اس نے پھر کاغذ کی تھیلی کا منہ کپّی کے کھلے ہوئے حصے کے اوپر رکھ دیا اور شدید دہشت کے عالم میں مجھے اندازہ ہونے لگا کہ تھیلی کے اندر کیا تھا۔۔۔ ایک چوہا کھڑکھڑاتا ہوا کپّی کے اندر آگیا۔

میرے سارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں کانپ گئی۔ لیفٹیننٹ نے کپّی کا کھلا ہوا حصہ قیدی کے مقعد کے اوپر رکھ کر چپکنے والے ٹیپ کے ساتھ مضبوطی سے جما دیا۔

میں ہر اس جنبش پر کانپ کانپ اٹھی جو وہ چھوٹا سا جانور اس کپّی کے اندر کر رہا تھا۔ وہ اس کپّی کے قید خانے پر کھرونچیں مار رہا تھا اور تیز آواز میں شدت کے ساتھ چیں چیں کیے جارہا تھا۔ اس قیدی کے چہرے پر بھی تنگ آمد کی تحریر واضح تھی اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

"بول، رنڈی کے جنے۔ تمہارا سرغنہ کہاں ہے؟"

"کس چوتیے نے حملے کا منصوبہ بنایا تھا؟"

قیدی دو ایک مرتبہ کراہا، مگر اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

لیفٹیننٹ نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا جو اس کے ساتھ وہاں آیا تھا' اس نے ماچس کی تیلی سلگائی اور ٹانکا لگانے والی دھونکنی کو جلا دیا۔ شعلے کی آنچ بڑھا کر اس نے آہستہ آہستہ لوہے کی سلاخ کو یہاں تک گرم کرلیا کہ اس کا سرا تپ کر سرخ ہوگیا۔ سلاخ اس نے لیفٹیننٹ کی طرف بڑھادی جو اس کو ہاتھ میں تھام کر قیدی کی طرف آیا اور احتیاط کے ساتھ اسے کپّی کے پیندے میں داخل کر دیا۔

دہکتی ہوئی آنچ نے چوہے کو پاگل بنا دیا۔ اس کے کھرینچیں مارنے میں وحشت بڑھتی گئی اور وہ باہر نکلنے کے لیے دیوانہ وار راستہ ڈھونڈتا رہا۔

اذیت پہنچائے جانے کے عمل کے دوران وہ قیدی پہلی بار چیخا اور اس شدت کے ساتھ تڑپنے لگا کہ چوہا اور بھی زیادہ خوفزدہ ہوگیا۔

لوئزا چیخ رہی تھی۔ وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔ اذیت دینے والوں نے ریڈیو کی آواز بڑھادی اور اس قیدی کے تڑپنے کا تماشا دیکھتے رہے جیسے اس کی تکلیف سے مسحور ہوگئے ہوں۔

تین مرتبہ لیفٹیننٹ نے سلاخ کو گرم کیا۔ لوئزا بے ہوش ہوگئی۔ قیدی بے حس وحرکت ہوگیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی انتڑیوں کے اندر چوہا دَم گھٹنے سے مرگیا۔ ہیبت کے احساس نے مجھے بے ہوشی کے عالم میں دھکیل دیا......

آنکھ کھلی تو میں نے فوراً بیچ والی مسہری کی طرف منہ کیا۔ قیدی کی لاش وہیں پڑی تھی۔ اس کے کولھوں کے شگاف میں سیاہی مائل سرخ خون کی لکیر تھی جس کے چاروں طرف غضب ناک ہوکر کاٹنے والے چوہے کے دانتوں کے نشان تھے اور چوہے کی لمبی اور بالوں سے عاری دُم قیدی کی مقعد سے باہر لٹک رہی تھی۔

"مار ڈالو مجھے!" میں دیوانہ وار چیخنے لگی۔

دوسری مسہری پر سے لوئزا پاگلوں کی جیسی ہذیاتی ہنسی کے مارے پھٹ

پڑی۔

"یہ مادر چو کتیاں، لے جاؤ انہیں یہاں سے!" لیفٹیننٹ نے چیخ کر کہا۔

ہمیں کھولا گیا، کپڑے پہنائے گئے، منہ پر نقاب چڑھائے گئے۔ ہمیں دروازہ سے باہر دھکیلا گیا تو لوئزا دیوانہ وار ہنسے چلی جارہی تھی۔

"ایک منٹ!" ہم دروازے سے باہر نکل رہے تھے تو لیفٹیننٹ نے چیخ کر کہا۔ میں نے سنا کہ وہ دھیمی آواز میں ایک محافظ سے کہہ رہا ہے:

"اس پگلی کو جنّت لے جاؤ اور دوسری کو اسی جگہ۔"

اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ لوئزا اسی عمارت میں ہے، جس میں میں ہوں۔ لیفٹیننٹ کی بات سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جنّت کا مطلب یہ ہوا کہ لوئزا کو مار ڈالا جائے گا۔

ہم باہر آگئے تو مجھے سنائی دیا کہ لوئزا کو ایک گاڑی میں دھکیلا جارہا ہے، جو فوراً ہی روانہ ہوگئی۔ میں گالیاں بکنے لگی اور جس بھی چیز کا اپنے قریب احساس ہوا، اس پر لاتیں مارنے لگی۔ وحشیوں کی طرح انہوں نے مجھے مارا اور ایک گاڑی میں ڈال دیا۔

ہم اس جگہ پہنچ گئے تو کوٹھری میں لے جانے کے بجائے انہوں نے میرے کپڑے پھاڑ ڈالے اور صحن میں ایک ستون سے باندھ دیا۔

ان میں سے ایک نے میرے بال اس زور سے گھسیٹے کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اب تم مزہ چکھو گی، غلیظ پگلی" وہ غصے میں چیخا۔

فروری ۱۰ تا ۱۲

شروع کی چند گھنٹے جو میں نے ستون سے بندھے بندھے گزارے وہ اس وقت تک قابل برداشت رہے جب تک سورج نہ نکل آیا۔ پہلے دن انہوں

نے کھانے کے لیے مجھے کچھ نہیں دیا اور پینے کے لیے وہی پسینہ جو میرے چہرے سے بہہ بہہ کر ہونٹوں پر آرہا تھا۔ اس کے اگلے دن بھی وہی۔

اس وقت تک میرے سارے بدن پر آبلے پڑ چکے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ جو درد مجھے بے حال کیے دے رہا ہے' وہ آنے والی حالت کا پیش خیمہ ہے۔ ذہن پر اپنی گرفت قائم رکھنے کے لیے بھوک کو مٹانا ضروری تھا۔ میں اپنے منہ پر بندھے نقاب کا ایک ٹکڑا چبانے لگی جو میں نے ہونٹوں کے اندر کھینچ لیا تھا۔

میں کپڑے کا ایک گول ٹکڑا' جس کا قطر دو انچ کے قریب ہوگا' کھانے میں کامیاب ہوئی' جس سے بھوک کا درد بھی مٹا اور چہرے پر تازہ ہوا بھی آئی۔ میری زندگی میں کم ہی ایسے موقعے آئے ہوں گے جب مجھے ایسی تسکین حاصل ہوئی ہو۔ میں اپنی ہوشیاری پر اس قدر فخر محسوس کر رہی تھی کہ میرے اندر جینے کی ایک نئی امنگ جاگ اٹھی۔ میں پیاس بجھانے کا کوئی طریقہ سوچنے لگی۔

یہ خیال بھی آیا کہ روؤں اور رو کر اپنے آنسو بوند بوند پی لوں مگر اب میں اتنی خوش تھی کہ رو نہیں سکتی تھی۔ شاید ایسا ہوتا ہے کہ میری تکلیفوں میں اس وقت کمی آجاتی ہے جب میں ان حالات کی بے معنویت کا شکار ہو جاتی ہوں۔ میں سکون کی حالت کے قریب پہنچ جاتی ہوں۔ کال کوٹھری کی تنہائی میں' میں اس نتیجے پر پہنچی کہ جب میں اس بے معنویت کو تسلیم کرنے کا انکار کرتی ہوں' اس وقت سب سے زیادہ دکھ بھوگتی ہوں۔

مگر اب میں خوش ہوں۔ سورج ڈھلنے کے بعد ٹھنڈی ہوا نے میرا برہنہ بدن چوم لیا جیسے میری بے معنی تسکین میں اضافہ کرنا چاہ رہی ہو۔ کتّے کے پلّے کی آواز نے مجھ سے پیاس بھلا دی اور میں غور سے سننے لگی۔ آواز تیز ہوتی جا رہی تھی اور ایک حدت میرے سارے بدن میں بیدار ہوتی جا رہی تھی۔

"رولیتو .... رولیتو" میں نے زیر لب کہا۔

پلّے نے کوں کوں کرنا بند کر دیا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے پیر چاٹ رہا ہے' اسی طرح جیسے رولیتو کیا کرتا تھا۔ "رولیتو' رولیتو" میں نے سرگوشی کی

اور اپنے آنسو نہ روک سکی۔ ایک ایک آنسو میں نے پی کر دیکھا۔ میں اسے دیکھنا چاہتی تھی، میں اسے چھونا چاہتی تھی، مگر رولیتو اب مجھ سے دور چلا گیا۔

میں نے اس سوراخ میں سے جھانکنا چاہا جو میں نے نقاب کو کھا کر بنا دیا تھا۔ میں نے سر ترچھا کیا اور صحن کے ایک چھوٹے سے حصے کو دیکھنے میں کامیاب ہو سکی۔ میں دہشت سے پیچھے ہٹنے لگی۔ وہاں، چاندنی میں مجھے سوکھا ہوا بچّہ نظر آیا جو زمین پر سے مجھے دیکھ رہا تھا، جس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں محبّت کی ناقابل بیان آرزو تھی۔

(باب ۱۴)

صبح ہونے تک میں روز نامچے پر ہی کام کر رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ سات بجنے میں ایک گھنٹہ باقی ہے، اب سونے کی کوشش کرنا فضول ہو گا۔ میں نے اپنے آپ کو باور کرایا کہ وعظ کے بعد اونگھ لوں گا۔

میں کمرے سے باہر نکلا اور جتنی تیز کافی برداشت کر سکتا تھا، بنائی۔ تھکنے کے علاوہ میں اپنے آپ کو بیمار محسوس کر رہا تھا اور یہ میرے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہو گا۔ باورچی خانے میں داخل ہوتے ہی جوانیتا نے تشویش سے میری طرف دیکھا۔

"کیا آپ بیمار ہیں، فادر؟"

"بیٹھ جاؤ" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا۔ لگتا تھا کہ وہ رو دے گی۔

"میں نہیں چاہتی کہ آپ کو کچھ ہو جائے" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"مجھے کچھ کیوں ہونے لگا؟"

"اگر انہوں نے آپ کو روزا کے ساتھ دیکھ لیا فادر، تو پھر آپ کو نہیں

چھوڑیں گے۔"

"انہوں نے ...... وہ کون ہیں؟" میں اپنے آپ کو وہی سوال پوچھتے ہوئے پاکر حیران رہ گیا جو سوزانا نے عمارت کے نگراں سے پوچھا تھا جب اس کے فلیٹ کو ملیشیا والوں نے برباد کرڈالا تھا۔

"آپ جانتے ہیں ..... وہی' فادر ..... میرا مطلب ہے ...."

"میں جانتا ہوں' میں جانتا ہوں" میں اٹھا اور عبادت کے لیے چلا گیا۔

اس سے فارغ ہونے کے فوراً بعد میں ڈاکٹر اورٹیز سے ملنے کے لیے چلا گیا۔

"میں سمجھتا تھا کہ اس شہر میں آپ میرے سب سے اچھے دوست ہیں۔" میں نے پورے خلوص مگر جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ وہ مجھ سے اس قسم کے فقرے کی توقع کررہے ہوں گے' کیوں کہ انہوں نے اس بات کی کوئی وضاحت طلب نہیں کی۔

"چاہتا تو میں بھی ہوں کہ اسی طرح رہے' فادر' لیکن بعض باتیں ایسی ہیں جنہیں بھلا دینا ہی بہتر ہے۔"

"کیا آپ انہیں بھلا سکتے اگر وہ سب روزا یا ماریا آر کے بیٹوں کے بجائے تمہارے ساتھ ہوا ہوتا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تو پھر؟" میں نے اصرار کیا۔ ایک لمحے کے لیے ڈاکٹر اورٹیز نے میری طرف سرکشی کے سے انداز میں دیکھا۔

"فادر رامیرو' انہیں بھول جاؤ .... بشپ بھی انہیں بھول چکا ہے" اس نے سکون کے ساتھ جواب دیا۔

میں مڑا اور ایک لفظ بھی کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ میں گرجا گھر کی طرف گیا۔ میری طبیعت خراب ہورہی تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے تفصیل کے ساتھ کاغذ کی پٹیوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ میں بے چین ہو رہا تھا۔ مجھ سے لیٹا نہ گیا۔ اچانک یاد آیا کہ میونسپل چیف کے ہاں رات کے کھانے پر جانا ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی اور کام میں جٹ گیا۔

صبح کے تین بجے تک میں نے مندرجہ ذیل عبارت پڑھ لی تھی۔

(باب ۱۵)

۱۳ فروری

میں اس جنسی جنونی کو پہچان گئی جب اس نے اپنے ساتھی سے سگریٹ مانگا، مگر آج اس نے اپنے معمول کے مطابق حرکتیں نہیں کیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ میں اس بچے کا (یا وہ کتا ہے؟) رونا اب اور نہیں سہہ پاؤں گی۔

اس رات جب وہ میرے لیے آئے تو اس سے تھوڑی دیر پہلے میں نے برابر کی کوٹھری کا دروازہ کھلنے اور کسی کے گھسیٹے جانے کی آواز سنی۔ یہ وہی کوٹھری تھی جس میں میں نے دو مرتبہ مہربان آنکھیں دیکھی تھیں۔ میں نے تصور کیا کہ وہ عورت اپنے اذیت دینے والے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ جلد ہی میری باری آگئی۔ مجھے جیپ پر ڈال دیا گیا اور ایک بار پھر کسی جگہ لے گئے۔ میں اس سفر میں کسی اور بدن پر ڈھیر پڑی ہوئی تھی۔ ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے تو انہوں نے ہمارے چہروں پر سے نقاب اتار دی۔ میری ساتھی وہی عورت تھی جس کا چہرہ مہربان تھا اور ہونٹوں پر دائمی مسکراہٹ۔ فوراً ہی انہوں نے ہمارے کپڑے اتار دیے اور مسہریوں سے باندھ دیا۔ وہ مجھ سے سوال پوچھنے لگے۔ انہوں نے مجھ سے نہ صرف سلویا اور اس کے دوست کے بارے میں پوچھا بلکہ دوسرے ناموں کا بھی تذکرہ کیا۔ ان میں سے ایک آدمی نے اس رسوائے زمانہ واقعے کا ذکر کیا جس میں تین ماہ پہلے ایک جنرل کو دہشت گردوں

نے قتل کر ڈالا تھا۔ مجھے اسی قدر معلوم تھا جو میں نے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا یا اخباروں میں پڑھا تھا۔ میں نے یہی بات ان سے بھی کہہ دی مگر بے سود۔ وہ میری آنکھوں، مسوڑھوں اور شرم گاہ پر "پیکانا" لگانے لگے۔

"سچ، ہمیں سچ سننا ہے!" ان میں ایک مجھ پر چیخا۔

یہ "کاروائی" کوئی آدھ گھنٹے جاری رہی اور جب انہیں احساس ہوا کہ میں بے ہوش ہونے والی ہوں تو وہ مجھے چھوڑ کر دوسری عورت کی طرف چلے گئے۔

وہ اپنے ساتھ ان کی کاروائی کو اسی دل کش مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی رہی۔ وہ دیکھتی رہی کہ اذیت دینے والا اس کے پیروں کی انگلی پر بجلی کا تار باندھ رہا ہے۔ ایک آدمی نے اس کی چھاتی پر سگریٹ رگڑ کر بجھا دیا۔

اسے پورے بدن پر صدمے دیے گئے اور مکّے مار مار کر "غائب" ہو جانے والے بعض لوگوں کی ماؤں کے بارے میں پوچھا گیا جو حفاظتی دستوں کے ہاتھوں منتشر کیے جانے کے بعد قصبے کے گرجا گھر میں پناہ گزین ہو گئی تھیں۔ اس کے جواب سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا لہجہ کچھ غیر ملکی سا تھا۔ اسی وقت لیفٹیننٹ اندر آیا، خاموشی کے ساتھ کاروائی دیکھی اور اچانک اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اذیت دینے والوں میں سے دو باری باری اس عورت کی عصمت دری کرنے لگے۔

پہلی بار یہ ہوا کہ اس عورت نے مسکرانا بند کر دیا۔ اس کی زندگی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید تھا۔

انہوں نے ہمارے چہروں پر نقاب باندھ دیے اور ہمیں واپس بھیج دیا۔ میں نے اس کو گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالے جانے کی آواز سنی۔

۱۴ فروری

وہ مسکراتے ہوئے چہرے والی عورت آج سہ پہر مرگئی۔ کھڑکی میں سے میں نے دیکھا کہ لیفٹیننٹ اس کے ہاتھ کلہاڑی سے کاٹ رہا ہے۔ میں نے اسے ستون کے پاس زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ اس کی کلائیاں اور ٹخنے چار کھمبوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سارے جسم پر آبلے تھے اور اپنا سر کبھی ادھر' کبھی ادھر کر رہی تھی کہ تیز دھوپ سے بچ سکے۔ جب میری جانب دیکھا' تو میں نے دوبارہ مسکراتے ہوئے دیکھا۔ میں دوزانو بیٹھ گئی اور اس کے لیے دعا مانگی۔

نہ جانے کب تک میں دوزانوں بیٹھی رہی۔ میں دوبارہ کھڑکی کے پاس گئی تو اس پر نزع کا عالم تھا اور لیفٹیننٹ اس کے جسم کو کلہاڑی سے مسخ کر رہا تھا اور دو آدمی دیکھ رہے تھے۔ اس نے عورت کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔

میں نالی کے قریب بیٹھ گئی اور ایک جھپٹے میں تین مکھیاں پکڑ لیں' پھر تیزی سے مکڑی کے جالے کے پاس آئی اور انہیں قربانی کے چڑھاوے کی طرح پیش کیا۔ نالی سے جالے تک میں متواتر سفر کرتی رہی یہاں تک کہ محافظ فوجی کوٹھری میں داخل ہوئے اور مجھے پلنگ سے باندھ دیا۔

میرے ہوش ذرا ٹھکانے آئے تو میں نے اپنے آپ کو پکارتے ہوئے سنا:

"اگر یہ لوگ یہ سب کچھ ہرے بھرے پیڑ کے ساتھ کرتے ہیں' تو سوکھے پیڑ کے ساتھ کیا کچھ کریں گے؟"

"یہ والی تو ابھی سے پاگل ہوگئی" ایک سپاہی نے کہا۔

"اگر یہ لوگ یہ سب کچھ ہرے بھرے پیڑ کے ساتھ کرسکتے ہیں' تو خشک پیڑ کے ساتھ کیا کچھ نہیں کریں گے؟" میں نے دہرایا۔ "اس لیے کہ اگر یہ لوگ یہ سب کچھ ....."

(باب ۱۶)

کل رات میں نے بڑا ہولناک خواب دیکھا۔ یہ مجھے عام طور پر نظر آنے والا ڈراؤنا خواب نہ تھا۔۔۔۔ ہیبت ناک شبیہیں، ابدی عذاب کی آگ، تھوتھنی والے درندے۔ اس مرتبہ مجھے یسوع مسیحؑ کا چہرہ نظر آیا جو سلاخوں کے پیچھے سے مجھے مسکرا کر دیکھ رہا تھا اور بازو پھیلا کر مجھے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ مگر میں پاس آتا تو وہ پیچھے ہٹنے لگتا یہاں تک کہ میں انہیں اس لمبی، پتلی کوٹھری سے الگ شناخت نہ کر پاتا۔

یہ کافی دیر تک ہوتا رہا، یہاں تک کہ میں رو پڑا، اور پھر یسوع مسیحؑ نے میرے پاس آنا شروع کیا، آہستہ، بہت آہستہ۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا کہ میں نور کے ہالے پر تیر رہا ہوں، میرا بدن ڈھیلا پڑا ہوا ہے اور اس کے اوپر خوشی کا عجیب سا احساس طاری ہے۔ یسوع مسیحؑ قریب سے قریب آنے لگے جیسے آہستہ روی کے عالم میں ہوں۔

جب وہ لوہے کی سلاخوں کے پاس آئے تو میں نے دونوں بازو پھیلا کر اپنے ایمان کے ثبوت کے طور پر ایک چھوٹی سی شبیہہ پیش کی، جو اوجھڑی کی بنی ہوئی تھی۔ یسوع مسیحؑ اس کی طرف بڑھے اور اس لمحے ان کے ہاتھ دو عدد خون آلود ساعد بن گئے جن پر میل کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ میں چیخیں مارتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

سویرے میری آنکھ کھلی تو میرا دل سوزانا کے خلاف نفرت سے بھر گیا۔ ایسا پہلے بھی ہوا تھا مگر اس شدّت کے ساتھ نہیں۔ یہ شبہ مجھے پریشان کیے جا رہا ہے کہ میں کلیسا کی اقدار سے دور ہٹتا جا رہا ہوں۔

آج صبح میں سوچتا رہا کہ کیا مجھے، اس روزنامچے کی نقل نویسی بند کر دینی پڑے گی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ مجھے سوزانا سے غدّاری اور کلیسا کے

درمیان انتخاب کرنا پڑے گا۔

میرا ذہن بہت منتشر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میری قسمت کبھی ختم نہ ہونے والی تنہائی بن کر رہ گئی ہے۔

آج صبح کی دعا میں، میں نے پولیس کے کپتان کو دو نئے چہروں کے ساتھ دیکھا۔ روزا، جس سے میں ایک دن بیچ ملتا رہتا ہوں، مجھے بتانے لگی کہ یہ دونوں شہر میں نئے وارد ہوئے ہیں اور ہر ایک چپکے چپکے یہ قیاس آرائی کر رہا ہے کہ یہ دونوں وفاقی ایجنٹ ہیں۔

یہ بات پریشان کن تھی، اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس بارے میں مزید معلومات حاصل کروں گا۔ اس رات جب میں گرجا کے سامنے چوک میں ٹہل رہا تھا تو میں نے ان دونوں سایوں کو دیکھا جو روزا کے گھر تک میرے پیچھے آئے تھے۔ میرا خوف جس حد تک وقار کی اجازت دیتا تھا، اس کے ساتھ میں اپنے کمرے میں واپس آیا، اپنے آپ کو یہ باور کراتا ہوا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

میں نے دعا مانگی کہ مجھے اس روزنامچے کو پورا کرنے کی مہلت مل جائے جس نے میرا تمام ممکنہ سکون برباد کر ڈالا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ روزنامچے کا سارا کام دو مرتبہ کروں گا اور ایک نقل روزا یا ماریا آر کے کو دے دوں گا جو باقاعدگی سے ہم سے ملا کرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں ان ماؤں پر بھروسا کر سکتا ہوں جن کے بچے ستم کا شکار ہوئے۔

اس رات میں بہت دیر تک کام کرتا رہا اور سونے سے پہلے میں نے مندرجہ ذیل حصہ نقل کر لیا تھا۔

(باب ۱۷)

۱۵ فروری

قدموں کی آہٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ چار ہیں۔ وہ برآمدے سے گھسیٹتے ہوئے مجھے باہر اس صحن میں لے آئے جہاں مجھے ستون سے باندھ دیا گیا۔ ہوا کے نرم، تازہ دم جھونکوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ علی الصبح ہے۔

جلد ہی سورج آگ برسانے لگا۔ پھر میں نے لیفٹیننٹ کی آواز سنی جو اب تک میرے لیے مانوس بن چکی تھی۔

"اسے قریب لے کر آؤ" اس نے کہا۔ پھر میں نے کراہوں کی، اور کئی لوگوں کے ستون کے قریب آنے کی آواز سنی۔

"تم اسے جانتی ہو؟" لیفٹیننٹ نے پوچھا۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز سنی۔ "اس کا چہرہ کھول دو" لیفٹیننٹ نے حکم دیا۔

میں آنکھیں جھپک کر اس اچانک روشنی کا عادی بنانے لگی تو لیفٹیننٹ نے دوبارہ پوچھا۔

"تم اسے جانتی ہو؟"

میرے سامنے سلویا کھڑی تھی، یا سلویا کا جو کچھ بچ رہا تھا۔ وہ اس دیوانگی سے مجھے تک رہی تھی کہ مجھے یقین ہے وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے جسم پر وحشیانہ سزاؤں کے داغ تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اس کے سوکھے گوشت سے ہڈیاں باہر نکل پڑیں گی۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے گرد زخم بنے ہوئے تھے۔ اس کی چھاتیوں پر سگریٹوں سے جلائے جانے کے پیپ بھرے زخم تھے۔

"اور تم، کیا تم اسے جانتی ہو؟" لیفٹیننٹ نے مجھ سے پوچھا۔ میں چیخوں کے مارے پھٹ پڑی، جیسے پاگل ہوگئی ہوں۔ لیفٹیننٹ نے متواتر مجھے تھپڑ

مارے کہ میرا منہ بند ہو جائے مگر میں بے قابو ہو کر چیختی رہی۔

"لے جاؤ اسے" لیفٹیننٹ نے بے صبری سے کہا۔

انہوں نے مجھے مسہری سے باندھ دیا اور میرے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ سلویا کی شبیہہ میرے ذہن پر طاری تھی' اور اس کے خلاف جو تمام عناد میرے دل میں بھرا ہوا تھا' اس کی جگہ ہم دردی نے لے لی۔

جھٹ پٹے کے وقت وہ محافظ ڈیوٹی پر آگیا جو مجھے کھول دیا کرتا تھا۔ وہ ترس بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتا تھا مگر کچھ کہتا نہ تھا۔ اب اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ اگر اس نے ٹیپ ہٹا دیا تو میں چیخوں گی نہیں۔

جیسے ہی وہ باہر گیا' میں کھڑکی کے پاس آگئی۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ سلویا کا بدن' ستون سے بندھا ہوا' چاندنی رات کے سائے میں پیلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہاں پر دو آدمی پٹوں سے بندھے ہوئے جرمن شیپرڈ کتوں کو اس کے بدن سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اس سے ان جانوروں کی بے تابی میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔

مجھ سے اور نہیں دیکھا گیا۔ میں نالی کے پاس دبے پاؤں آئی اور پھر واپس مکڑی کے جالے پر۔ وہاں مکھیاں نہیں تھیں۔ میں ٹہلتی رہی یہاں تک کہ میں نے کتوں کے آپس میں لڑنے کی آواز سنی۔ بد ترین خیالات ذہن میں لیے' میں پکار اٹھی' "کتے کی اولاد...... کتے کی اولاد!" میں نے پوری طاقت سے دونوں کان بند کر لیے۔

۱۶ فروری

آج حیرت انگیز طور پر انہوں نے مجھے روزمرہ کے پھیکے قلیے اور نمکین سوئیوں کے ساتھ گوشت کا ایک ٹکڑا بھی دیا۔ وہ محافظ جو بولتا نہیں تھا' میرے لیے ایک سیب لایا۔ میں گوشت تو نہیں کھا سکی مگر میں نے سیب آہستہ آہستہ کھایا' ایک ایک ٹکڑے کا مزہ لے لے کر۔

میرا پیٹ ایسی ضیافتوں کا عادی نہیں رہا تھا۔ مروڑ کے مارے میری حالت غیر ہو گئی۔

وقت گزرتا رہا اور میں نے کوٹھری کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ تین سپاہی اندر آئے۔ مجھے برہنہ کر دیا گیا پھر ایک اور لباس پہننے کے لیے کہا گیا۔

"اچھا، تو ہڈّی ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے" ان میں سے ایک نے کہا۔ باقی سب ہنس پڑے۔

میں نے اپنے کندھوں اور کولھوں کا غیر معمولی دبلا پن دیکھا تھا مگر اس سپاہی کے اس فقرے سے احساس ہوا کہ مجھے اب بس چند دن زندہ رہنا ہے۔ اس وقت تک میرے سارے بدن میں درد رہنے لگا تھا۔

سپاہی مجھے ایک گاڑی تک لے آئے اور میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے اذیت گاہ واپس لے جائیں گے۔ گاڑی کے نچلے حصّے سے آنے والی آوازیں میرے لیے ذرا بھی مانوس نہیں تھیں، اور جوں ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سفر معمول سے زیادہ طویل ہے، مجھے یہ خوف ستانے لگا کہ "ہڈّی ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے" کا مطلب ہے کہ دنیا میں میرا وقت اب پورا ہو گیا۔ میں موت کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نڈھال ہو کر مسلسل سسکیاں بھرے گئی۔ یہ سفر تین یا چار گھنٹے کا ہو گا۔ آخر میں نے ایک آواز سنی "ہالٹ!" اور ہم اس جگہ رک گئے جو میرے اندازے کے مطابق سپاہیوں کا اڈّہ ہو گی۔

آگے کی سیٹ سے ایک سپاہی اتر گیا اور فوراً ہی لوٹ آیا۔ گاڑی تھوڑی دور اور چلی، پھر پانچ منٹ بعد دوبارہ رک گئی۔ دو آدمیوں نے مجھے گاڑی سے باہر نکالا اور میں نے اندازہ لگایا کہ ہم دیہات میں ہیں۔ اردگرد خاموشی تھی اور دور کہیں کتّے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

مجھے بجری اور کنکر کے راستے پر سے گزار کر ایک برآمدے سے لے جایا گیا۔ مجھے ایک کمرے میں زبردستی داخل کیا گیا، جس کے بارے میں میں نے اندازہ لگایا کہ چھوٹا سا ہے۔

مجھے ایک پلنگ سے باندھ دیا گیا جس پر پتلی رضائی کا کپڑا پڑا ہوا تھا۔ سپاہی چلے گئے۔ مجھے بڑی تسلی ہوئی کہ مجھے مارا نہیں جائے گا۔ میں سو گئی۔

(باب ۱۸)

ایک تاریخ کے اندراجات طویل ہوتے جارہے تھے اور مجھے کاغذ کی لمبی سے لمبی پٹیوں میں انہیں تلاش کرنا پڑتا تھا۔ میں اس کا سبب اس بات کو سمجھتا ہوں کہ یہ دن سوزانا کے ذہن میں واضح تر ہوں گے کیوں کہ یہ نسبتاً حالیہ تھے۔

میری اپنی حالت خراب ہوئی جارہی ہے۔ میں غذا کی کمی کا شکار ہوں۔ میں کم زور ہوگیا ہوں۔

پچھلی جمعرات کو میں صبح کی عبادت کے دوران بے ہوش ہوگیا۔ سب سے پہلے جو لوگ میری مدد کو آئے وہ پولیس کپتان اور دونوں وفاقی ایجنٹ تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے اس وقت ہوش آگیا جب وہ مجھے اٹھا کر کمرے میں لے جانے والے تھے۔

اس سے مجھے احساس ہوا کہ مجھے اپنی صحت اور اس روزنامچے کی طرف سے مزید احتیاط برتنی ہوگی۔

آج مجھے بشپ اوانڈو کی طرف سے ایک اور خط ملا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ میں فوراً ہی شہر آکر ان سے گفتگو کروں۔ مجھے بشپ انتونیلی کی طرف سے بھی ایک خط ملا جس میں یہ الفاظ پڑھ کر میں بشاش ہوگیا کہ انہیں اعتماد ہے کہ میرے پاس کوئی معقول وجہ ہوگی جو میں نے ''بشپ اوانڈو کو کسی قدر متفکر کر رکھا ہے۔'' مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ میں اب اس گفتگو کو مزید ملتوی نہیں کرسکتا۔

آخر کار میں نے اگلے پیر کو بس سے جانے کا فیصلہ کیا۔ جانے سے پہلے میں

روزنامچے کے سارے کاغذات اسی ڈبے میں رکھ کر روزا کے ہاں لے جاؤں گا۔ ان کی ترتیب کو دوبارہ بحال کرنا مشکل کام ہوگا، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے سوا اور کیا کرسکتا ہوں۔ کل رات بہت کوشش کے بعد میں نے یہ نقل کیا۔

(باب ۱۹)

۷ افروری

میں نے اپنے دروازے کا قفل کھلنے کی آواز سنی اور کوئی میرے پلنگ کے پاس آیا۔

"اسے کل رات لائے ہیں۔"

"اسے دوسروں کے ساتھ لے جاؤ۔" پہلی والی آواز نے ہدایت دی۔ انھوں نے مجھے کھول دیا اور آنکھوں پر سے نقاب اتار دیا تو میں نے دیکھا کہ میں ایک کوٹھری میں ہوں جو پچھلی والی سے تھوڑی چھوٹی ہے اور جس کی دیواروں پر ہلکا سبز رنگ تازہ تازہ کیا گیا ہے۔ ایک کھڑکی پر باہر کی طرف سے دفتی کا چوکور ٹکڑا لگا دیا گیا تھا۔

میرے گرد تین آدمی تھے۔ وہ جس نے میرے کھول دیے جانے کا حکم دیا تھا، نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھا، جب کہ باقی دو فوجی لباس میں تھے۔ میرے کپڑے اتارے گئے اور ہتھ کڑیاں پہنادی گئیں، اور سوٹ والا شخص لاتعلقی سے دیکھتا رہا۔

"صحن کی طرف" اس نے مجھ سے کہا گویا مجھے پہلے سے معلوم ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

میں نے جنبش تک نہیں کی، اور وہ دونوں آدمی مجھے دھکیلتے ہوئے دروازے

سے باہر لے گئے۔ ہم ایک تنگ برآمدے سے گزرے جس کے دونوں طرف میری کوٹھری جیسی اور کوٹھریاں تھیں۔ برآمدے کے سرے پر ایک دفتر تھا جس میں ہال کے رخ پر شیشے والی کھڑکی تھی اور سیدھے ہاتھ پر ایک نیم وا دروازہ کسی ایسے کمرے کا، جو غسل خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ الٹے ہاتھ پر چھوٹا برآمدہ تھا۔

سپاہیوں نے مجھے اسی سمت دھکیل دیا اور ہم صحن میں نکل آئے جس کے چاروں طرف پختہ دیواریں تھیں، کوئی دس فٹ اونچی اور ان کے اوپر کانٹوں دار تار کے چھ گھیرے۔ ایک دیوار کے سامنے کئی ایک برہنہ بدن مردوں اور عورتوں کو کھڑا کیا ہوا تھا۔ ان کے کوئی پچاس گز پیچھے چار سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ مجھے مضحکہ خیز حد تک دبلے اور لمبے ایک آدمی کے، جو گرنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے جدوجہد کیے جا رہا تھا، اور اس عورت لوئزا کے بیچ میں کھڑا کر دیا گیا، جس کی ٹانگ اذیت رسانی کے دوران ٹوٹ گئی تھی اور جو چوہے والے واقعے کے دوران میرے ساتھ لیٹی رہی تھی۔ مجھے یقین نہ آیا کہ اس کو زندہ دیکھ کر میں کس قدر خوش ہوئی۔ آخری مرتبہ میں نے اس کو دیکھا تھا تو مجھے خیال تھا کہ لیفٹیننٹ نے اسے سزائے موت سنا کر اپنے آدمیوں سے کہا ہے کہ اسے "جنت" پہنچا دیں۔ میں بھی اب اس جگہ پہنچ گئی ہوں گی جسے "جنت" کہتے ہیں۔

لوئزا نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوئی ہے۔ جلدی سے اس نے اپنی آنکھیں دیوار کی طرف پھیر لیں کہ ہمارے رابطے کا کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ اچانک سپاہیوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور ہمارے چاروں طرف گولیاں سنسنانے لگیں۔ وہ ناقابل یقین حد تک دبلا آدمی خون میں نہایا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

مجھے احساس ہوا کہ سپاہیوں کا مقصد ہمیں مارنا نہیں تھا، بلکہ دہشت زدہ کرنا تھا، لیکن اس دبلے آدمی کو اپنا توازن برقرار رکھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ ایک گولی اس کے سر کے آر پار ہو گئی۔

چند لمحوں بعد میں نے سپاہیوں کو شہری لباس والے شخص سے معذرت کرتے سنا کہ ہماری گولیوں سے وہ آدمی ہلاک نہیں ہوا ہے۔ کئی عدد بوٹوں کی ایڑیاں جوڑنے کی آواز آئی' اور ایک سپاہی نے زور دے کر کہا:

''اور نہ میری گولی سے' کرنل صاحب۔''

''کوئی بات نہیں' ہمیں پریشان کرنے والا ایک دہشت پسند کم ہوا'' اعلا لباس والے شخص نے کہا۔

ہمیں فوراً کوٹھریوں میں واپس بھیج دیا گیا۔ لوئزا میرے سامنے والی کوٹھری میں تھی۔

اس دفعہ مجھے نہ باندھا گیا نہ آنکھوں پر پٹّی باندھی گئی' اس لیے جوں ہی وہ وہاں سے باہر نکلے میں نے اپنے کپڑے اٹھالیے جو فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ پھر میں دبے پاؤں کھڑکی کی طرف گئی اور دفتی میں بنے چھوٹے سے سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔ مجھے وہاں صحن نظر آرہا تھا جس میں ابھی ہم موجود تھے۔ دبلے آدمی کی لاش اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔

۲۰ فروری

یہاں سب کچھ بہتر ہے۔ ایک شک سا ہوتا ہے کہ سلویا کی موت کا اس سے گہرا تعلق ہوگا اور اس احساس سے میں اپنے آپ کو قدرے بہتر محسوس کرتی ہوں۔

یہاں مجھے کہیں زیادہ باقاعدگی سے کھانا مل رہا ہے' جتنا کہ پہلے کسی قید خانے میں نہیں ملا۔ یہاں کے سپاہی اتنے زیادہ وحشی اور انسانیت سے عاری نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں سے ایک نے مجھے منہ دھونے کی اجازت بھی دے دی اور میں اپنا بدن بھی دھولیتی لیکن وہ مجھے کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا اور مجھے اپنے ننگے پن پر شرم آگئی۔

میرے جذبات بیدار ہورہے ہیں۔ امید کی ایک کرن ہے جسے میں تھامے

ہوئے ہوں۔

کھڑکی پر لگے ہوئے دفتی کے سوراخ میں سے، میں نے جھانکا کہ لوئزا چہرے پر پاگلوں کی طرح ہمہ وقت مسکراہٹ سجائے، اپنے سر کے چاروں طرف غیر مرئی مکھیوں کا پیچھا کرتی رہتی ہے یا سر کو کھبڑ کھبڑ کھجاتی رہتی ہے جیسے اس میں جوؤں کا جتھا بس رہا ہو۔ سپاہی اس کی حرکتوں کو بے ضرر دیوانگی سمجھتے ہوئے اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ آزادانہ بات چیت کرنے دیتے ہیں اور بغیر ہتھ کڑیوں کے گھومنے دیتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ لوئزا اپنے قید کرنے والوں سے کہیں ہوش مند ہے۔ مین نے اسے ایک سانولے قیدی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے جس کی مونچھیں آدھی جلی ہوئی تھیں۔

میں نے لوئزا کو ایلیشیا سے باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، وہی عورت جو حاملہ ہے اور اس وجہ سے لیفٹیننٹ نے اسے ''پیکانا'' سے معاف کر دیا تھا اور جس کے غیر معمولی حسن نے مجھے اذیت گاہ میں ششدر کر دیا تھا۔ میں یہ بھی قسم کھا سکتی ہوں کہ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ کوئی دیکھ نہیں رہا، لوئزا نے کوئی چیز اس کی طرف بڑھائی۔

آج میرے دروازے کا سوراخ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا تو میں نے جھانک کر دیکھا کہ لوئزا کی کوٹھری کے دروازے پر قفل نہیں ہے۔ وہ برآمدے میں آگے پیچھے جھاڑو لگا رہی تھی اور منہ ہی منہ میں کچھ بدبدائے جا رہی تھی۔

میں اس کی حرکتیں دیکھنے میں منہمک تھی یہاں تک کہ میں نے آہٹ سنی جو اس کے قدموں کی نہیں تھی۔ میں عین اس وقت دروازے سے پیچھے ہٹی جب کہ کوئی اس سوراخ کو بند کرنے آ رہا تھا۔ میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی کہ سوراخ تھوڑی دیر کے لیے کھلا اور کاغذ کا ایک ٹکڑا، گول لپٹا ہوا اندر آیا اور میرے پیروں کے پاس گرا۔

میں نے احتیاط سے کھولا۔ اس پر دو لفظ لکھے ہوئے تھے، ''بہادری اور ہمت۔''

یہ الفاظ اتنے شان دار محسوس ہوئے کہ میں رونے لگی۔ میں نے انہیں سینکڑوں بار پڑھا۔ سپاہیوں کی شفٹ تبدیل ہونے سے پہلے میں نے کاغذ کو مروڑ کر گول کیا، اچھی طرح چبایا اور نگل گئی۔

(باب ۲۰)

شہر کا سفر معمول کے چھ گھنٹوں سے زیادہ عرصے تک جاری رہا، اس لیے کہ پرانی کھڑ کھڑاتی بس کے کاربوریٹر میں گڑ بڑ تھی اور ایک مرتبہ ٹائر پنکچر بھی ہوگیا۔ جب میں آخر کار شہر پہنچا تو سہ پہر ہو چکی تھی اور میں تیزی سے کلیسا کی طرف گیا تاکہ بشپ اوانڈو سے ملاقات کر کے جلدی سے نمٹ جاؤں، ان کی ڈانٹ سن لوں اور شام سات بجے والی بس پکڑ کر واپسی کا سفر کروں۔

بشپ اوانڈو بھی میری طرح بے چین تھے کہ بات صاف کر لیں، اور انہوں نے مجھے انتظار نہیں کرایا۔ ان کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ فوراً مطلب کی بات پر آجاتے تھے۔

"تم بیمار لگتے ہو" انہوں نے خلوص اور گرم جوشی سے کہا۔

"میری صحت اس سے بہتر کبھی نہیں رہی، حضور والا" میں نے جھوٹ بولا۔

"فادر انتونیو" انہوں نے میری صحت پر مزید وقت ضائع کیے بغیر کہا، "تمہارے حلقے میں سب کچھ اس طرح نہیں ہو رہا جس طرح ہونا چاہیے۔"

"میں اعتراف کر لوں، حضور والا کہ بعض امور کی وجہ سے مجھے تبلیغ کے کام کو محدود کرنا پڑ رہا ہے لیکن جلد ہی سب کچھ معمول کے مطابق ہو جائے گا۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ امور کیا ہیں؟" انہوں نے اس لہجے میں سوال کیا جو دوسرے کا اعتماد حاصل کرنے کا کوئی خاص سبب نہیں بن سکتا تھا۔

میں اپنے ضمیر سے لڑتا رہا، دو متضاد کیفیات کے درمیان گومگو کی حالت میں

رہا کہ ایک طرف اپنے اعلا افسر کی پاس داری اور دوسری طرف یہ خوف کہ ان کے سامنے سچ بول دیا توان کا ردِّعمل کیا ہوگا۔

"بستی میں کچھ لوگوں کو غائب کر دیا گیا ہے" میں آخر پھوٹ پڑا۔

انہوں نے پلک تک نہ جھپکائی۔

"تواس سے تمہارا کیا تعلّق ہے؟"......

میں گفتگو کے یہ رخ اختیار کرنے سے پریشان سا ہوگیا۔"میں نے اپنا دینی فرض سمجھا کہ اپنے وقت کا کچھ حصّہ ماؤں کے دکھ بانٹنے کے لیے وقف کر دوں۔"

"یہ تمہارا کام نہیں ہے۔"

"میں تو سمجھتا تھا کہ ہے۔"

"تمہاری بستی کے حکّام تمہاری اس بات سے خوش نہیں ہیں کہ تم ان عورتوں کے بیٹوں کے بارے میں کرید رہے ہو۔"

"میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، حضور والا! میں تو صرف ان خاندانوں کو بچّوں کے غم کی وجہ سے تسلّی دے رہا ہوں۔"

"میں ایک پادری کی حیثیت سے تمہارے احساس ذمہ داری کے بارے میں سوال نہیں کر رہا ہوں، لیکن صاحبان اقتدار سے بہترین تعلقات قائم رکھنے میں ناکامی مجھے ایسی کوئی عقل مندی کی بات نہیں معلوم ہوتی۔"

"کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم صرف حکومت کا لحاظ رکھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن کلیسا میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو اس روّیے کے بارے میں سوال اٹھاتے ہیں۔"

"کیا تم ان میں سے ہو؟"

"جبر اور قتل کے سامنے ہماری خاموشی کوئی ایسی بات نہیں جس پر ہم فخر

کر سکیں۔"

"میں پھر سے پوچھتا ہوں، کیا تم ان لوگوں سے اتفاق کرتے ہو جو یہ کہتے ہیں کہ کلیسا نے مفاہمت کرلی ہے؟"

"شاید" میں نے کہا۔ "اور جو پادری ماضی میں ناانصافی پر احتجاج کرتے تھے، انہیں تخریب کار سمجھ کر قتل نہیں کر دیا جاتا تھا۔" میں حد سے بڑھ گیا تھا۔ بشپ اٹھ کھڑے ہوئے، اور بڑی مشکل سے اپنی برہمی کو چھپایا۔

"یاد رکھو، فادر انتونیو کہ حقیقت صرف اور صرف ایک ہے۔ ہمارے دشمن مجسّم شر ہیں اور انہیں ختم کر دینا چاہیے۔ آخر کو، شر سے لڑنا ہمارا مقدس مقصد ہے۔ جو لوگ لادینی نظریات لادنے کی کوشش کررہے ہیں، ان کے اصول اٹل ہیں۔ لیکن ہمارے اصول بھی اٹل ہیں۔ کلیسا کو طاقتور رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو شک وشبہ کی وجہ سے کمزور نہ پڑنے دیں۔ یہ ہمارا پختہ یقین ہی تھا جس کی وجہ سے کلیسا اتنا مضبوط ادارہ بنی رہی ہے۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہارے جذبات نہیں سمجھتا۔ مجھے معلوم ہے کہ یسوع مسیحؑ کی تعلیمات اور مسلح افواج کا مذموم مقصد الگ الگ ہیں، لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ خود ہماری بقا ان لوگوں پر منحصر ہوسکتی ہے جن کو ہم میں سے بیش تر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"

میں نے ان کے اس دلیرانہ بیان پر ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔

"اپنی بقا کے مسئلے سے الجھے رہنا اس وقت مشکل ہوجاتا ہے جب آپ کے سامنے اس ماں کا واقعہ پیش آرہا ہو جس کے بچے کو قاتل اٹھا کرلے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری مداخلت ان ماؤں کا دکھ بڑھا ہی سکتی ہے۔"

میں ان کے اس خلوص سے قائل نہ ہوسکا۔

"کیا میں اس کا مطلب یہ سمجھوں کہ آپ مجھے منع کررہے ہیں کہ ان ماؤں کو

وہ وقت نہ دوں جس کی وہ میرے خیال میں حق دار ہیں؟''

''نہیں، فادر، میں اس کو منع نہیں کر رہا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ میں اس پر زور دے رہا ہوں کہ آپ دوسرے لوگوں پر زیادہ توجّہ دیں جو ہمارے تبلیغی مقصد اور اس مقصد کو آگے بڑھانے والی کلیسا کی مدد کر سکیں۔''

''یعنی کہ میونسپل کمیٹی کا سربراہ، دو وفاقی جاسوس اور وہ خواتین و حضرات جو اپنے آپ کو عیسائی قرار دیتے ہیں لیکن منہ پھیر لیتے ہیں تاکہ انہیں سرکاری قتل و غارت گری نہ دیکھنا پڑے، صرف اس لیے کہ یہ جو قتل ہو رہے ہیں، اغوا ہو رہے ہیں، جو اذیت اٹھا رہے ہیں، وہ ان کے بچّے نہیں ہیں۔''

اس پر بشپ نے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی تمام کوششیں ترک کر دیں۔ انہوں نے گلے میں پڑی صلیب پر ہاتھ پھیرنا روک دیا اور عین میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''فادر انتونیو'' انہوں نے برہم ہو کر کہا ''میں ان ''غائب'' ہو جانے والے لوگوں کی ابتلا اور جو قتل کیے گئے ہیں ان کے ساتھ پیش آنے والی بربریت کو سمجھتا ہوں، مگر اس ساری صورت حال کا کوئی حل ایسا نہیں جو ہم پیش کر سکیں۔ میں تمہیں اپنے مسئلوں پر غور و فکر کرنے کے لیے مزید وقت دوں گا، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم جلد ہی کس حل تک نہیں پہنچ گئے تو تمہاری صحت برباد ہو جائے گی۔''

''حضور والا، مجھے اپنے جسم کی صحت کی اتنی پروا نہیں ہے بلکہ مجھے روح کی سالمیت کو برقرار رکھنا ہے۔''

بشپ اوانڈو آرام کرسی پر ڈھیر ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک لمحے کے لیے وہ چھت کو تکتے رہے، صلیب پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ گہری خاموشی کمرے پر طاری ہو گئی۔

''کیا تم کلیسا کے مکان میں رات گزارنا چاہتے ہو؟'' اچانک انہوں نے پوچھا۔

"میں سات بجے والی بس سے واپس جانے کو ترجیح دوں گا۔" میں نے کہا۔

"تقدیر تمہارا ساتھ دے!" انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا کہ میں انگشتری کو بوسہ دے سکوں۔

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے ان کی آواز سنی "انتونیو" میں رک گیا۔ "بزدل بھی معاف کر دیے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں چاہتا بھی تو جواب نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ کسی حوالے سے کہہ رہے ہیں۔

"واپسی کے سارے سفر میں میرے ذہن میں جیسے آگ بھڑکتی رہی۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ روزنامچے پر کام کی رفتار بڑھا دوں گا۔ یقین تھا کہ بشپ اوانڈو سے میری یہ گفتگو آخری تھی۔

چھکڑا بس صبح کے ایک بجے بستی میں داخل ہوئی۔ میں نے روزا کو جگایا اور ڈبا اپنے کمرے میں لے آیا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تک میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں اب تک آدھا روزنامچہ پڑھ چکا ہوں۔

(باب ۲۱)

۲۲ فروری

ایک سپاہی مجھے غسل خانے لے کر گیا اور برآمدے میں، میں ایلیشیا کے سامنے سے گزری۔ وہ پورے دنوں سے تھی اور لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے بچّے کو جنم دے سکتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ چلنے والے سپاہی سے باتیں کر رہی تھی اور جب میرے سامنے سے گزری تو اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

اس کے بعد کا سکون برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنے ماں باپ اور نیستور کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں شدید مایوسی کا شکار ہوگئی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر

رو پڑی۔

پچھلے کئی دن سے میرے سر میں بھیانک درد اٹھ رہا ہے اور چکّر آرہے ہیں۔ دو مرتبہ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔

۲۲ فروری

میرے دروازے کا سوراخ ذرا سی دیر کے لیے کھلا اور کاغذ کی ایک اور چھوٹی سی گڈی کوٹھری کے فرش پر گر پڑی۔ اس مرتبہ یہ اس پتلے کاغذ کے ٹکڑے تھے جو سگریٹ کی ڈبیا کے اندر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ "یقین اور امید"، پہلے دن کی طرح لکھا ہوا تھا۔

میں فوراً ہی دبے پاؤں دروازے تک گئی اور دروازے سے کان لگا دیے، اس امید پر کہ لوئزا کی ناقابل فہم بڑبڑاہٹ یا اس کی ٹانگ گھسٹنے کی آواز آئے گی۔ مجھے کچھ نہیں سنائی دیا۔

میں کاغذ کے اس ٹکڑے کو بار بار پڑھتی رہی، جس طرح اس دن والے کاغذ کو پڑھا تھا۔ پھر میں نے اس کو پرزہ پرزہ کرکے نالی میں بہا دیا۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ جس سپاہی کو میں نے ایلیشیا کے ساتھ دیکھا تھا، وہ اندر آیا۔

"چلو اٹھو" اس نے کہا۔

ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ مجھے صحن میں لے آیا اور مجھے ہدایت دی کہ فرش پر بیٹھ جاؤں جہاں ایلیشا اور ایک عورت، جس کی ٹانگوں پر جلنے کے کچّے کچّے زخم تھے، پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہاں دو اور عورتیں اور تین مرد تھے۔

اپنی خراب ٹانگ گھسیٹ کر لوئزا سارے صحن میں چہل قدمی کر رہی تھی، اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی اور خیالی مکھیاں اڑا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہمارے سامنے کھڑی ہو جاتی اور فحش اشارے کرتی۔

سپاہی ہنس پڑے اور لوئزا نے انہیں دیوانہ وار ہنسی سے نوازا۔ ایک مرتبہ

وہ ہمارے قریب آئی ایک عجیب رقص کرنے لگی' جو فلیمنکو اور رمبا کا امتزاج تھا اور اس کے لنگڑے پن کی وجہ سے ڈراؤنا ہوگیا تھا۔

میں نے اس عبرت ناک نظارے سے منہ پھیر لیا اور ایلیشیا کی خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھا۔ وہ میرے قریب آگئی اور میرا ہاتھ چھوکر کاغذ کا ایک ٹکڑا سرکا دیا۔ ''اسے اپنی شرم گاہ میں رکھ لو'' اس نے کہا۔ لوئزا نے جو کچھ کیا' وہ توجّہ بٹانے کے لیے تھا۔

یہ اطمینان کرلینے کے بعد سپاہی میری طرف نہیں دیکھ رہے' میں نے وہی کیا جو مجھ سے کہا گیا تھا۔ میں اب کوٹھری میں واپس جانے کے لیے بے چین تھی۔ جوں ہی میں اندر آگئی اور انہوں نے دروازہ بند کردیا' میں نے کاغذ کے اس ٹکڑے پر پڑھا:

''میرا ایک دوست سپاہی ہے جس کے بیٹے کی جان میرے شوہر نے بچائی تھی جو ڈاکٹر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں اس سب کے بارے میں لکھنا چاہیے تاکہ دوسروں کو بھی معلوم ہو کہ کیا ہورہا ہے۔ ہم اس کا اطمینان کرلیں گے کہ تم جو بھی لکھو' وہ دوسروں تک پہنچ سکے۔ چند دن کے اندر وہ تمہاری نگرانی کم کردیں گے اور شاید یہ بھی ممکن ہو جائے کہ ہم بات چیت کرسکیں۔ طاقت اور ہمّت۔''

مجھے احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں۔ میں الفاظ بار بار' بار بار پڑھے گئی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا' بس یہ سوچ کر ہی کہ میں اپنی مصیبت کو بیان کر سکوں گی میری ہمّت بڑھنے لگی۔

(باب ۲۲)

میں کل ساری رات سو نہ سکا اور دن کی روشنی نے کمرے میں سائے پھیلانے شروع کیے' میں اٹھ کر باورچی خانے میں آگیا کہ کافی بنالوں۔ حوانیتا

برابر کے کمرے میں سو رہی تھی، کھڑپڑ سن کر باہر آگئی۔

"آپ کے لیے کافی بنا دوں، فادر؟" اس نے ایک الماری کھولتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"جاؤ، جاکر سو رہو" میں نے درشتی سے کہا۔

وہ اس طرح پیچھے ہٹی جیسے میرے لہجے سے اسے ڈنک لگا ہو۔ میں نے دوسرے کمرے میں اس کے سسکیاں بھرنے کی آواز سنی۔

آہستہ آہستہ میں صبح سات بجے کی عبادت کے لیے تیار ہونے لگا اور بشپ کے ساتھ اپنی گفتگو بھی یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر بے کار۔ مجھے صرف اس کے چند حصے یاد آرہے تھے، اور وہ بھی واضح طور پر نہیں۔

ایک بات کا مجھے یقین تھا: واپسی کے سفر کے دوران، میں نے طے کیا تھا کہ ان کے بعض مشوروں پر عمل کروں گا تاکہ وہ مجھے اس وقت تک میرے حال پر چھوڑ دیں جب تک کہ میں اس روزنامچے کو پورا نہ کرلوں۔ مگر اب یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ مشورہ کیا تھا۔

گرجا کو انتظامی دفاتر سے ملانے والی ایک پتلی سی راہداری میں، میں ڈگمگاتا ہوا جارہا تھا کہ مجھے چکر آنے لگا۔ میں ایک پرانی سی ڈیسک سے ٹیک لگا کر کھڑا رہا یہاں تک کہ کچھ جان میں جان آئی۔ منبر پر میں نے پوری کوشش کی کہ اپنی کم زوری کو چھپالوں۔

عبادت کے دوران میں نے ان ہی پرانے چہروں کو ان ہی پرانی جگہوں پر دیکھا۔ پہلی قطار کے نمایاں خواتین وحضرات، کپتان صاحب جن کے دائیں بائیں وہ دونوں وفاقی جاسوس اور پولیس کمشنر دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر دو قطار خالی چھوڑ کر روزا، ماریا آرکے اور غریب محلوں کے لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد۔ وعظ کے درمیان حصے تک ہر چیز ٹھیک ٹھاک جارہی تھی اور میں گناہ کے بارے میں عمومی طور پر باتیں کر رہا تھا تو کمشنر اور وفاقی جاسوس خوش نظر آرہے تھے اور پیچھے کی صفوں والے بے زار۔

ان میں سے ایک جاسوس نے آگے جھک کر کپتان کے کان میں کچھ کہا۔ کپتان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں نے یسوع مسیحؑ سے غداری برتنے والے جوڈاس کی مماثلت ان جابروں سے بیان کی جو دہشت کے ذریعے حکومت کرتے ہیں۔

میں نے اذیت پہنچانے والوں کو ''جذباتی طور پر مفلوج'' قرار دیا اور ان لوگوں کے کرب کا حوالہ دیا جن کے عزیز پیارے ''غائب'' ہوگئے۔ خاتمہ کلام میں نے اس درخواست پر کیا کہ ''جبر کے مقتولین'' کے لیے دعا مانگیں۔ پیچھے کی صفوں والوں نے تو خوشی خوشی اس میں شمولیت کی، لیکن آگے کی صف والے اسی وقت دعا مانگنے کے لیے جھکے جب انہوں نے کپتان اور پولیس کمشنر کو دوزانو دیکھا۔

میں نے عبادت ختم کی تو ہر ایک جانے کے لیے بے قرار تھا۔ کپتان دروازے تک پہنچ گیا تھا کہ میں نے اسے پکارا۔ اس کے دونوں ساتھی لپک کر اس کے برابر آگئے۔

''وہ کھانے کی دعوت ابھی تک برقرار ہے؟'' میں نے دیدہ دلیری سے پوچھا۔ وہ تینوں تعجب سے منہ تکنے لگے۔

''آپ جب چاہیں'' کپتان نے مجبوراً مسکراتے ہوئے کہا۔

''کل رات آٹھ بجے؟''

''بالکل!'' اس نے کہا۔

وہ کچھ اور کہنے والا تھا مگر مڑا اور دروازے کی طرف چلا گیا۔

''کپتان!'' میں نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

''جی فرمایے؟''

”کیا آپ کو زحمت ہوگی اگر یہ دو حضرات کل مجھے اپنے ساتھ لے چلیں؟“

”کوئی خاص وجہ؟“ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”مجھے ڈر ہے کہ کوئی مجھے مار نہ ڈالے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کا کوئی خدشہ نہیں“ کپتان نے حقارت کے ساتھ مجھے یقین دلایا۔

”اچھا، تو پھر میں خود ہی آجاؤں گا۔“

وہ چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میری کیفیت میں کوئی بہتری نہیں ہوئی۔ میں دوپہر تک اسی روزنامچے پر کام کرتا رہا اور حوانیتا سے کہا کہ کھانا تیار کرلے، جس سے وہ بہت خوش ہوئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کرلیا اور ۲۴، ۲۵ فروری کے اندراجات نقل کیے۔

(باب ۲۳)

۲۴ فروری

وہ لوئزا تھی جسے میں نے سب سے پہلے دیکھا۔ وہ بری طرح لنگڑا رہی تھی اور دونوں ہاتھ سے سر کھجا رہی تھی۔ صحن میں وہی لوگ تھے، سوائے ایلیشیا کے، جو اسی سپاہی کے ساتھ ذرا دیر بعد وہاں آگئی۔ سپاہی کو کوئی اعتراض نہ ہوا جب وہ اکڑوں بیٹھنے میں ایلیشیا کی مدد کرنے لگی ---- اس کا بڑھا ہوا پیٹ اس کے لیے مشکل کا سبب بن رہا تھا۔

اسے زمین پر آرام سے بیٹھتے دیکھ کر وہ سپاہی قریب ہی کھڑے ہوئے دوسرے سپاہیوں کے پاس چلا گیا۔ ایلیشیا انتظار کرتی رہی کہ لوئزا اپنا وہی نِش تماشا شروع کرے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے ایک ہاتھ گھٹنے پر رکھا دیا

اور اسے دوسرے ہاتھ سے ڈھانک لیا۔

اپنے لباس کی سیون سے اس نے ایک بال پوائنٹ کا روشنائی والا کارٹرج نکالا۔ وہ اس نے میرے حوالے کیا اور مجھ سے کہا کہ اسے اپنے کپڑوں میں چھپالوں۔ میں نے آہستہ سے دو ٹانکوں کے درمیان اُڑس لیا۔ میں یہ کام مکمل کرچکی اور ایلیشیا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

""لوئزا یا میں، کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تمہیں فراہم کرتے رہیں گے" اس نے سرگوشی کی۔ "ان پر لکھتی رہنا اور جب لوئزا جھاڑو دینے آئے، جب دروازے کا روزن کھلے تو کاغذ باہر پھینک دینا۔ اگر لوئزا خود روزن نہ کھولے تو اس کا مطلب ہے کہ وہاں کوئی اور موجود ہے۔"

"اور اگر کسی دن وہ نہ آئے؟"

"تو پھر چھپا دینا اور جب تم صحن میں آؤ تو مجھے دے دینا۔"

"کہاں؟"

"کہاں کیا؟"

"کہاں چھپاؤں گی اسے؟"

ایلیشیا نے مذاق کے انداز میں میری طرف دیکھا اور مسکرادی۔ میں سمجھ گئی۔

"کاغذ کے یہ ٹکڑے اس قید خانے سے باہر کیسے لے جائے جائیں گے؟" وہ مسکرادی۔ لیکن اس وقت اس نے ایک سپاہی کو آتے ہوئے دیکھا اس لیے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دوسری طرف چلا گیا تو میں نے پھر پوچھا "جو لکھا جائے وہ کہاں پہنچے گا؟"

ایلیشیا نے اس سپاہی کی طرف دیکھا جو مستقل اس کے ساتھ رہتا تھا اور

ایک لمحے کے لیے ہچکچائی۔

''میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتی'' اس نے کہا۔

''یہ معلوم کرنا میرا حق ہے۔''

''تمہارے نوٹس ایک جگہ جمع کیے جائیں گے اور ہم میں سے جو سب سے پہلے آزاد ہوگا' وہی ان کے ساتھ کچھ کرے گا جو ہم طے کریں گے۔'' ایلیشیا نے سیدھا جواب دینے کے بجائے مجھے سمجھایا۔

اسی وقت سپاہی وہاں آکر کھڑا ہوگیا۔ ہم نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ کوٹھری میں' میں اس سب کے بارے میں سوچتی رہی۔ میرے اندر ایک بے اطمینانی سرابھارنے لگی۔ یہ سب کچھ بہت آسان تھا۔ کیا یہ جال تھا؟ اس رات میں نے اگلے دن ایلیشیا کے لیے کچھ امتحان تجویز کیے۔

۲۵ فروری

ساری رات میں کوٹھری کے دروازے کھلنے اور برآمدے میں لوگوں کے گھسیٹے جانے کی آوازیں سنتی رہی۔ میں ایک پل نہیں سوئی۔ کھڑکی کے ذرا سے سوراخ سے میں نے جھانکا کہ سویرا ہوچکا ہے۔

وہ ایک مرتبہ مجھے غسل خانے لے جاتے تھے اور کئی گھنٹوں کے بعد کھانے کو دیتے تھے۔ برآمدے میں' میں نے لوئزا کو جھاڑو سے خیالی کوڑا صاف کرتے ہوئے دیکھا مگر ایلیشیا کہیں نظر نہیں آئی۔

اس دن وہ مجھے پھر سے صحن میں لے گئے جہاں میں نے دیکھا کہ دو آدمی اور تھے' مگر جلی ہوئی ٹانگوں والی وہ عورت نہیں تھی۔ کافی دیر کے بعد ایلیشیا باہر آئی اور اس کے ساتھ رہنے والے سپاہی نے اسے میرے پاس بیٹھنے میں مدد دی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا میں بیمار ہوں جو اس قدر سنجیدہ نظر آرہی ہوں۔

''اگر تمہارے لیے کوئی تحریر یہاں سے باہر بھیجنا ممکن ہے تو تم اپنے گھر

والوں کے نام خط کیوں نہیں لکھتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

ایلیشیا نے میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، اس کو مار دیں گے۔'' اس نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ میں جیسے ہل گئی مگر میں نے کوشش کی اتنی آسانی سے اپنے آپ کو مطمئن نہ ہو جانے دوں۔

''لیکن لوئزا یا میں تمہارے رشتہ داروں سے رابطہ کر سکتی ہیں'' میں نے تجویز پیش کی۔

''لوئزا کا وہاں کوئی نہیں ہے اور تم، تم تو ابھی زندہ ہو! اگر تمہیں رہائی ملتی بھی ہے تو رہائی کے وقت تک تمہارے زندہ رہنے کا اسی قدر امکان ہے کہ تمہارے خاندان والوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ تم کہاں ہو۔''

میں نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

''اگر تمہارے خاندان والوں نے تمہارے یہاں ہونے کے بارے میں لوگوں کو بتا دیا تو تم 'غائب' ہو جاؤ گی یا تمہارا 'تبادلہ' کر دیا جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی گڑبڑ نہ ہو تو وہ چند ماہ کے بعد یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تمہیں عدالت کے سپرد کر دیں اور تمہارے اوپر کوئی نہ کوئی فرد جرم عائد کر دیں۔''

''تم کو یہ سب کیسے پتہ ہے؟''

ایلیشیا نے سپاہی کی طرف دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔

''تم کیا چاہتی ہو کہ میں کیا لکھوں؟'' میں نے پچھا۔

''تم جس سب سے گزری ہو اور جو تمہیں اب بھی برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔''

''کیا یہ طے ہو گیا کہ ہم میں سے جو بھی سب سے پہلے آزاد ہو گیا' وہ ان

تحریروں کو کس کے پاس لے جائے گا؟"

"بشپ انتونیلی" اس نے کہا۔

"نہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ فادر انتونیو کے پاس لے جائی جائیں۔ یہ میری واحد شرط ہے۔"

ایلیشیا نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

"تمہیں اس کا یقین ہے؟"

"مجھے یقین ہے۔"

"اور یہ فادر انتونیو کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ یہ پتہ کرنا پڑے گا۔"

"کس کے ذریعے؟"

"غالباً بشپ انتونیلی سے۔"

ایلیشیا کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔ وہ کچھ کہنے والی تھی کہ سپاہی ہمیں کوٹھریوں میں واپس لے جانے کے لیے آگئے۔ اس رات میں معمول سے زیادہ پریشان اور افسردہ تھی۔

میں نے یاد کرنا چاہا........

(باب ۲۴)

۲۵ فروری کا اندارج نامکمل تھا۔ باقی کی گم گشتہ عبارت کے لیے میں نے ساری صبح پورا کمرا چھان مارا، مگر وہ نہ ملی۔ میں اس بات سے بے چین ہوگیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر وہ مل جائے گی۔ اس امکان کو میں

اپنے ذہن سے کوشش کے باوجود خارج نہیں کر سکا۔

اس رات میں ڈاکٹر اورٹیز سے ملنے گیا۔ مجھے سائیکاٹری کی کچھ کتابیں درکار تھیں جو میں نے اس کے کمرے میں دیکھی تھیں۔ اس نے اتنی خوش مزاجی سے میرا استقبال کیا کہ میں اپنے آپ کو چال باز سمجھنے لگا۔ اس نے مجھے اندر کمرے میں بلایا اور میری صحت کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اسے تسلی دینے کے بعد کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میں نے اچانک اس سے سوال لیا:

"آپ ان افراد میں صدمے کے بعد کے اثرات کے بارے میں کیا جانتے ہیں جو شدید ذہنی اور جسمانی سزاؤں کو جھیل چکے ہوں؟"

ڈاکٹر اورٹیز نے اس طرح سے میری طرف دیکھا جیسے میں اپنے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ روزا اور حوانیتا کے ذریعے مجھے بستی میں پھیلنے والی اس افواہ کا علم تھا کہ پادری "بیمار" ہے، اس لیے میرے اس روّیے پر زیادہ حیران نہیں ہوا۔

"زیادہ نہیں" اس نے کہا۔ "اس لیے کہ میں سائیکاٹرسٹ نہیں ہوں۔ لیکن میں بعض علامات کی شناخت کر سکتا ہوں۔"

"مثلاً؟"

"اچھا" اس نے یہ کوشش کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ان علامات کے حوالے سے زیادہ پریشان نہ کرے، جو اس کے خیال میں میری اپنی علامات تھیں۔ "مریض میں بنیادی علامات ہوتی ہیں، اور منسلکہ علامات۔"

"پہلے بنیادی علامات کے بارے میں بتائیے" میں نے اس انداز سے کہا جیسے میں بدترین خبر کے لیے تیار ہوں۔

"مشکل یہ ہے کہ یہ عارضے چوں کہ شدید ترین جسمانی یا جذباتی دباؤ کے ردِعمل کے طور پر پیش آتے ہیں، اس لیے ان کے رائج ہونے کو کسی نہ کسی مخصوص تناؤ کے حوالے سے ہی زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے۔"

ظاہری طور پر ڈاکٹر صاحب میرے پوچھنے کی وجہ جاننا چاہتے تھے۔

"اپنے سائنسی اور تجزیاتی ذہن کو ایک طرف رکھ دو اور اس معاملے کو میرے لیے عمومی طور پر بتا دو" میں نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

ڈاکٹر صاحب کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے، پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ جنگ ہاری جا چکی ہے۔

"صدمے کے بعد کے مریضانہ اثرات (Post-Traumatic Syndrome) ایک مستند اور باقاعدہ عارضہ ہیں، جس کی تعریف بہت سی متنوّع حالتوں کے حوالے سے وضع کی گئی جن میں شدید دباؤ پڑتا ہے، جیسے کیمپ میں رکھے جانے والے قیدی، دست بدست جنگ میں شامل سپاہی، اور شدید حادثے، ریپ اور قدرتی آفات اور دوسری اسی قسم کی کیفیات۔"

"یہ علامات کیا ہیں؟"

"اس عارضے میں ڈراؤنے خواب، بار بار دہرائے جانے والے خواب، گھبراہٹ، بے خوابی، ذہنی ارتکاز میں کمی، چڑچڑاپن، حد سے بڑھا ہوا حسّاس پن، افسردگی اور دوسری حالتیں شامل ہیں۔"

"اس سے منسلکہ علامات کون سی ہیں؟"

"بہت سی ہیں" ڈاکٹر اورنز نے کہا "لیکن سب سے زیادہ نمایاں چکّر، سردرد، جذباتی تلوّن اور اعصاب زدگی ہیں۔"

جو میں نے سنا تھا اس پر مطمئن ہو کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ مایوس نظر آنے لگے۔

"میری باتوں سے مدد بھی ملی؟" انہوں نے پوچھا۔

"لگتا تو ہے۔"

ہم دروازے تک پہنچے تو اس نے میرا بازو تھام لیا۔

"فادر، میں مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"اب کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔"

اپنے کمرے میں واپس آکر میں نے روزنامچے پر کام کرنے کی کوشش کی، مگر توجہ نہ دے سکا۔ میں بستر پر پڑا چھت کو گھورتا رہا اور سوزانا کے بارے میں جو کچھ اس کے روزنامچے سے معلوم ہو سکا تھا، ڈاکٹر اور ٹیز کے ساتھ اپنی گفتگو کی روشنی میں اس کا تجزیہ کرتا رہا۔ ساڑھے سات بجے جوانیتا نے دروازہ کھٹکھٹایا اور یاد دلایا کہ مجھے کپتان صاحب کے ساتھ رات کا کھانا کھانا ہے۔ میں بادلِ ناخواستہ اٹھا اور دھیرے دھیرے راستہ چلتا ہوا پانچ گلیاں عبور کر کے کپتان کے گھر پہنچا۔

چاہتا تو میں یہ تھا کہ ملک کی جو حالت ہو رہی تھی، اس کے بارے میں اپنے غصے کا اظہار ان لوگوں میں سے ایک کے سامنے کروں جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ مگر اب شدید بے زاری نے مجھے آلیا۔ میں پہنچا تو کپتان صاحب اور ان کی بیگم بہت اخلاق سے پیش آئے۔ ہم مختلف بے ضرر موضوعات کے بارے میں گپ شپ کرتے رہے لیکن جب کپتان صاحب کی بیگم کافی لے کر آئیں تو میں نے اذیت رسانی کا موضوع چھیڑ دیا۔

"اس کے بارے میں بات نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، لیکن یہ یاد رکھیے کہ ہم ایک دوسرے کی بات اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ اپنی اپنی برہمی کو پس پشت نہ ڈال دیں۔" کپتان نے تنبیہ کی۔

"آپ کو کیسے معلوم کہ میں برہم ہوں جب کہ ہم نے اس موضوع پر پہلے کبھی بات نہیں کی؟"

"کیا آپ خود اپنے وعظ نہیں سنتے رہے، پادری صاحب؟" کپتان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں آپ نے کبھی یہ نہیں سمجھا ہو گا کہ میں آپ کی ذات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں؟" میں نے اس کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لیے چھیڑا۔

''میں آپ سے سچ کہوں، فادر، اب مجھے اس کی پروا نہیں رہی۔ میں نے یہ سیکھ لیا ہے کہ دل میں کینہ رکھے بغیر اپنا فرض نبھائے جاؤں۔'' اس نے خلوص کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا اسی وجہ سے تم نے میرے خلاف کارروائی کا حکم نہیں دیا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ سے سچ کہوں، مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔'' اس نے پر تفنن نظر آتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں آپ کو ایک ایسا شخص سمجھتا ہوں جس کے مقاصد نیک ہیں لیکن جو واقعات کی بے پناہ انسانیت سوزی سے پریشان حال ہوگیا ہے۔''

''آپ کا یہ اعتراف کہ ہم کسی قسم کی اجتماعی درندگی کا سامنا کر رہے ہیں، مجھے حیران کیے ڈال رہا ہے۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا!'' کپتان نے اصرار کیا۔

''تمہارا مطلب یہی تھا۔''

''لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا کہ واقعات بے جواز تھے۔''

''تو کیا وہ ایسے ہیں؟''

''آپ کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ آدرشوں کی خاطر لڑتے ہوئے بعض مرتبہ تشدّد کی بدصورتی کا سہارا لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے'' اس نے کہا۔

''ان میں سے اکثر اتنے معصوم نہیں ہیں جتنے آپ سمجھ رہے ہیں۔ بہرحال، اذیت رسانی کا غیر انسانی عمل بھی درست ہے، اگر اس کا مقصد ایسی معلومات کا حصول ہے جس کے ذریعے سے لادینی عقائد کا خاتمہ ممکن ہو۔ یہ جتنا بھی قابلِ نفرت معلوم ہو، ہمیں بعض مرتبہ اذیت پہنچانے والے لوگوں کی نفرت اور ظلم کا فائدہ اٹھانے چاہیے تاکہ ہم اپنی اخلاقی اقدار کی حفاظت کا مقصد حاصل کر سکیں'' کپتان نے ایسے لہجے میں کہا کہ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں رہا کہ اس کے

اپنے خیال میں وہ سو فی صد درست تھا۔اس کی بات جاری رہی:

''اذیت پہنچانے والے آپ کے لیے ناپسندیدہ ہوں گے، لیکن وہ بھی لاشعوری طور اپنی جان تک اس مقصد کے لیے قربان کر دینے کو تیار ہیں جسے وہ نیک اور اعلا خیال کرتے ہیں۔''

''آپ اپنے آپ کو ولی قرار دیتے دیتے رک گئے'' میں نے کہا۔

''وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنے پیاروں کی بہتری کے لیے کرتے ہیں: بیوی، بچے، گھر والے۔ اور اس کلیسا کے اعلا مقاصد کی حفاظت کے لیے بھی، جس کی نمائندگی آپ کرتے ہیں، فادر۔''

''مجھ پر یہ احسان نہ کرو'' میں نے جواب دیا۔

''اتنی سختی مت کیجیے، فادر۔جنہیں آپ اپنے وعظ میں 'کٹر پنتھی' اور 'جذباتی طور مفلوج' قرار دیتے ہیں، ان میں سے بیش تر وہ خام مواد ہیں جن سے ایک عظیم قوم کا مستقبل تعمیر ہوگا'' اس نے ٹھنڈے دل سے کہا۔

''تم سمجھ دار آدمی ہو، کپتان۔ پھر بھلا ایسا کیوں ہے کہ تم تعلیم کی قوت پر یقین نہیں رکھتے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں معاملہ شر سے ہے، پادری صاحب، جسے صرف زبردستی کے ذریعے ہی سبق سکھایا جاسکتا ہے۔ ہم ہر بات پر نکتہ چینی کرنے والے دانش وروں کی ایک ٹولی کے لڑکھڑاتے ہوئے عدم تحفظ کا سہارا نہیں لے سکتے۔''

''لیکن الفاظ کم از کم قتل تو نہیں کرتے۔''

''تمام تر احترام کے ساتھ عرض کروں کہ فادر، کلیسا کے بعض افراد قائل کرنے کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔ لادینیت کی وبا سے نبٹنے کے لیے الفاظ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔اس کے برخلاف زبردستی اگر پوری بے رحمی کے ساتھ برتی جائے تو پوری طرح قائل کر کے چھوڑتی ہے۔ دہشت بعض مرتبہ مقدّس بن جاتی ہے۔''

"اس کم زور اور بے سہارا عورت کی درد بھر چیخیں کس طرح درست ٹھہر سکتی ہیں، جس کی عزت اور وقار کی وحشیانہ طور پر دھجیاں بکھیر دی گئیں اور جسے ظالمانہ اذیت پہنچائی گئی؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

مجھ سے اب وہ فطری لہجہ برداشت نہیں ہو رہا تھا جس طرح کپتان بات کر رہا تھا۔ میرے سینے میں درد کی ٹیس اٹھی۔ حالاں کہ وہ اذیت پہنچانے والوں کا ذکر شخص غیر کی طرح کر رہا تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، تجربے کی بناء پر کہہ رہا تھا۔ مجھے بہت عجیب سا لگا کہ اس نے اپنے دونوں بچّوں کو بوسہ دیا جب وہ شب بخیر کہنے کے لیے اس کی گود میں آئے۔ اس کی آنکھوں میں شفقت کا سایا دیکھ کر میں اس منظر کی مہملیت پر برافروختہ ہو گیا۔ میں اس لاحاصل گفتگو کو جاری رکھنے میں اب مزید کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔

کپتان نے مجھے دروازے تک پہنچا دیا بلکہ الوداع کے طور پر میرا کندھا بھی تھپتھپایا۔

"ہم دوست رہیں گے، فادر۔ بہت اچھے دوست" اس نے مجھ سے وعدہ لینے کے بعد کہا کہ یہ "آخری کھانا" نہیں ہو گا۔

میں پونے گیارہ بجے گھر پہنچا اور صبح کے چار بجے تک روزنامچے پر کام کرتا رہا، مگر جوش و جذبے کے بغیر۔

(باب ۲۵)

۲۶ فروری

کاغذ کا پہلا ٹکڑا جو لوتزا نے کوٹھری کے اندر آج صبح پھینکا، وہ سگار کی پٹّی تھی۔ دوسرا کاغذ اشتہار تھا جو گھریلو سامان کی ایک مشہور دکان کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ میں پٹّی سے زیادہ اشتہار پر لکھ سکتی تھی، حالاں کہ پٹّی پر میں

"ایل ہاہانو" کے نشان کے حروف کے بیچ کی جگہ بھی استعمال میں لے آئی۔

لکھ چکی تو بڑے صبر کے ساتھ لوئزا کے اشارے کا انتظار کرتی رہی اور اس کے بعد روزن میں سے کاغذ کی گولی بنا کر پھینک دی۔ آج سہ پہر صحن میں لے جایا گیا تو ایلیشیا کے چہرے کی تسکین سے مجھے معلوم ہوگیا کہ پہلا پیغام باہر جاچکا ہے۔ میں نے اتنا فخر محسوس کیا کہ شاید ہی کبھی اور کیا ہوگا۔

۲ مارچ

شام کے جھٹ پٹے سے پہلے دروازے کا روزن دو مرتبہ کھلا اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے دستے فرش پر گرا دیے گئے۔ آج کا دن خوشی میں گزرا۔

(باب ۲۶)

آج اتوار کا دن تھا۔ عبادت کے فوراً بعد دوافروش کی تیسری بیٹی کو بپتسمہ دینا تھا۔

رسم ختم ہوئی تو دوافروش نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس "چھوٹی سی تقریب" میں شرکت کروں گا جس کا اہتمام اس نے رات کو اپنے گھر پر کیا تھا۔

میں رات ساڑھے آٹھ بجے تک روزنامچے پر کام کرتا رہا، روزا کے ہاں چلا گیا اور گیارہ بجے تک رہا۔ واپس آکر روزنامچے پر دوبارہ کام شروع کر دیا۔ میں نے نظر اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ میں بپتسمہ کی ضیافت بھول ہی گیا تھا۔

میں باہر آیا اور دوافروش کے گھر تک کا راستہ بھاگتے ہوئے طے کیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ بتیاں بجھ چکی تھیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ گرجے تک واپسی کے سارے راستے میں تمام مکانوں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور سڑک پر

کوئی ذی روح نہیں تھا' سوائے ان دو سایوں کے' جنہیں میں نے چوک پر بنی ہوئی یادگار کے پاس ایک بنچ پر سے اٹھتے ہوئے دیکھا تھا' اور جو دوا فروش کے گھر تک اور پھر واپس' میرے پیچھے پیچھے گئے تھے۔

میں گھر میں داخل ہوا تو میں نے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں ان کے وجود سے باخبر ہوں۔ میں نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر انہیں سلام کیا۔ دونوں سائے چوک کی یادگار کے پیچھے غائب ہو گئے۔

(باب ۲۷)

۱۰ مارچ

پچھلے آٹھ دن شدید جذباتی ہیجان میں گزرے۔ اپنے اغوا کے بعد سے پیش آنے والے ہر واقعے اور ہر بات کو جو مجھے یاد آ رہی ہے' میں تحریر میں لا رہی ہوں۔ میں ان واقعات کو یاد کرنے کی جدوجہد کر رہی ہوں جنہیں میں نے لاشعور کی گہرائی میں اتار دیا تھا۔

شروع میں' مجھے یہ خیال تھا کہ لکھنے کے لیے کاغذ کے حصول میں مشکل ہو گی۔ لیکن لوئزا اس کی فراہمی میں کبھی ناکام نہیں ہوئی۔ وہ اتنی مختلف شکلوں' رنگ اور اقسام کے کاغذ کہاں سے لے آتی تھی' یہ ایک بھید معلوم ہوتا ہے۔

آج ایلیشیا نے مجھے بتایا کہ کاغذ کے ٹکڑوں سے تقریباً بھرا ہوا ڈبا باہر موجود ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ لوئزا کو بتا دے کہ اتنا بہت سا کاغذ میری کوٹھری میں نہ پھینکے' میں اس کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ بڑھے ہوئے پیٹ کو سنبھالتے ہوئے ایلیشیا نے کہا کہ شاید چند دن میں سلاخوں کے پیچھے پیدائش کے بارے میں لکھ رہی ہوں گی۔ پچھلے آٹھ دن میں' میں نے دیکھا ہے کہ سپاہی لامحالہ مرد قیدیوں پر صحن میں زیادہ کڑی نگرانی کرتے ہیں' حالاں کہ

وہاں عورتیں زیادہ تعداد میں موجود ہوتی ہیں۔ ان کا مردانہ احساس انہیں یہ باور کراتا ہے کہ مرد زیادہ ذہین ہیں اس لیے زیادہ خطرناک ہیں۔

ان کاغذوں کے لکھنے سے مجھے بہت تسکین ملی ہے۔

میں مردوں کے بارے میں اپنے رویے کی تبدیلی سے ڈرتی ہوں۔

جس دن مجھے اغوا کیا گیا' اس دن تک مجھے مردوں میں کج روی کے بارے معلوم نہیں تھا۔ اس وقت تک اپنے ابّا اور نیستور سے ہی سابقہ پڑا تھا۔

ساری عمر میرے ابّا ہی وہ واحد شخص تھے جن کے پاس میں سہارے کے لیے جاتی تھی۔ میں ان کو ناقابل شکست مہاسورما سمجھتی تھی جس کے لیے کوئی بھی کام ناممکن نہیں' اس کے باوجود وہ اتنے نرم دل اور مشفق ہیں کہ جب بھی میں تکلیف میں ہوں' میرے آنسو پونچھ کر تسلی دیں گے۔

نیستور کی محبّت اور وفا نے بھی مجھے ہمیشہ مردوں کے بارے میں طاقت' رحم دلی اور نرمی کے حوالے سے سوچنے پر اکسایا۔

درد اور تکلیف کا جو سامنا اسے میڈیکل کالج میں کرنا پڑا تھا' اس کی وجہ سے نیستور دکھ درد کے معاملے میں بے حس نہیں ہوگیا تھا۔ غذا کی کمی کا شکار کسی بچّے کی طرف نظر بھر کر دیکھ لینے کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں گہری اداسی دیکھی ہے۔

لیکن وہ مرد جو ہمیں اذیت دیتے ہیں' ریپ اور بد فعلی کرتے ہیں' کیا ان کے بچّے نہیں ہیں' جو ان کی طرف دیکھیں؟ اور میں نے اپنے اذیت دینے والوں میں سے ایک کی آنکھوں میں نرمی دیکھی ہے جب وہ اپنی بیٹی کی لکھی ہوئی نظموں کا ذکر کر رہا تھا اور میری شرم گاہ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر ڈر جاتی ہوں کہ میرے ابّا اور نیستور ان مردوں جیسے نہ ہوجائیں' اور یہ سوچتی ہوں کہ شاید وہ بھی ایسے ہوں۔

۱۱ مارچ

آج ہمیں جلدی صحن میں لے جایا گیا۔ ایلیشیا اور میں پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سپاہیوں کی نظریں بچا کر چند ایک الفاظ کا تبادلہ بھی کر لیتے کہ اتنے میں ہم نے لوئزا کو دیکھا کہ جھاڑو پر باقاعدہ سوار ہو کر ہمارے سامنے سے گزر رہی ہے اور چار انگلیاں اکڑا کر فوجی سیلوٹ کر رہی ہے۔ اس طریقے سے وہ ہم پر ظاہر کر دیتی تھی کہ اس نے کتنے کاغذ اٹھائے ہیں۔ میں نے کھلے ہاتھ سے چہرہ چھپا کر اشارہ کیا کہ میں نے روزن سے کاغذ کی پانچ گولیاں پھینکی تھیں۔ لوئزا دوسری بار ہمارے سامنے سے گزری اور اس نے چار انگلیوں والا سیلوٹ دہرایا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ایلیشیا نے بھی ایسا ہی کیا۔ اب کی بار ہم اپنی گھبراہٹ چھپا رہے تھے۔ ایلیشیا نے سرگوشی کی کہ اس کا خیال تھا کہ ہمیں اتنی صبح سویرے صحن میں لایا جانا اس بات کا اشارہ تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ہمارا لہو سرد ہو گیا جب کرنل اور لیفٹیننٹ دو آدمیوں کے ساتھ آئے، جنہیں ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چکّر کاٹتے رہے، اور مرد قیدیوں کے عین سامنے پہنچ کر رک گئے اور ایک ایک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگے۔ وہ بہت گھور گھور کر ایک دبلے پتلے آدمی کی طرف دیکھتے رہے جو پتلے فریم کی عینک لگائے ہوئے تھا اور ان کی نظروں کا سامنا دلیرانہ انفعال کے ساتھ کرتا رہا۔

۱۲ مارچ

کھویا ہوا کاغذ نہیں ملا۔ آج صحن میں لوئزا نے تیزی کے ساتھ چار انگلیوں سے سر کھجا کر اصرار کیا کہ اس نے کاغذ کے چار ہی پرزے اٹھائے ہیں۔ ایلیشیا اور میں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ بیٹھیں۔ وہ بھی اتنی خوفزدہ ہے جتنی کہ میں۔ میں نے غور کیا کہ وہ عینک والا آدمی باقی قیدیوں کے درمیان موجود نہیں تھا۔

۱۳ مارچ

انہوں نے ہمیں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور دو آدمی جو کرنل اور لیفٹیننٹ کے ساتھ آئے تھے، ہم کو کاغذ کا ایک ٹکڑا اور پنسل بانٹنے لگے۔ پھر کرنل آگے بڑھا۔

"جو میں کہوں گا لکھ کر دکھاؤ!" وہ دھاڑا۔

میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میرا سارا بدن تھرا گیا۔

"..... جب آخری مرتبہ ف۔الف کو دیکھا تھا اور میں نے ان کی ہمیشہ تسلّی دینے والی مسکراہٹ کا تصور کیا" اس نے ہمیں لکھوایا۔

مجھے ایسا لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔

خدایا! یہ ۲۵ فروری کے اندراج کا آخری حصّہ تھا۔

۱۴ مارچ

سارے دن میں انتظار کرتی رہی کہ لوئزا کاغذ کا ایک پرزہ تو میری کوٹھری میں پھینک دے۔ جب دوپہر تک اس نے ایسا نہ کیا تو میں بے صبری ہو گئی۔ جب مجھے صحن میں لے جایا گیا تو مجھے ایلیشیا دکھائی نہ دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلّی دینا چاہی کہ عام طور پر ایلیشیا کو میرے بعد نکالا جاتا تھا۔ میری پریشانی حد سے سوا ہو گئی جب وقت گزرتا رہا اور ایلیشیا نہیں آئی۔

لوئزا بھی وہاں موجود نہیں تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب مجھے اس کی کوٹھری کے پاس سے گزارا جا رہا تھا تو دروازے پر قفل لگا ہوا تھا۔

پھر اپنی کوٹھری میں واپس آکر میں نے دیکھا کہ لوئزا کی کوٹھری کا روزن، جو میرے دروازے کے روزن کے عین سامنے ہے، کھلا ہوا ہے۔ میں پلنگ پر بیٹھی برے برے خیالات کا شکار رہی۔ میں نے یاد کرنا چاہا کہ میں نے اس کھوئے

ہوئے کاغذ پر کیا لکھا تھا۔ مجھے یاد نہ آیا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

کل رات میں نے برآمدے میں شور سنا۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیے۔ میں نے کئی آوازیں اور چند ایک کراہیں سنیں۔ میں پلنگ پر واپس آئی تو پسینہ پسینہ ہو رہی تھی اور اوندھے منہ لیٹ کر رونے لگی۔ ذرا دیر' میرے دروازے کے قفل میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ اس لمحہ میرا پیشاب نکل گیا اور میرا بدن گندہ ہو گیا۔

جو سپاہی اندر داخل ہوا' وہی تھا جو ہمیشہ ایلیشیا کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اسے میرے خوف کا اندازہ ہو گیا' اس لیے کہ اس نے مجھے اطمینان دلایا۔ اس نے کہا کہ وہ تو بس ایلیشیا کی طرف سے یہ کہنے کے لیے آیا ہے کہ اسے درد شروع ہو گئے ہیں اور غالباً بچہ اسی رات پیدا ہو جائے گا۔

میں نے اس آدمی سے کبھی بات نہیں کی تھی مگر میرا جی چاہا کہ اس کا منہ چوم لوں۔ میں نے اپنے اس جذبے پر قابو پایا اور پلنگ کے کنارے پر بیٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ واپس جانے لگا تو میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ ایلیشیا اور اس کے بچّے کا کیا بنے گا۔ اس نے کہا کہ بچّہ اس وقت تک ماں کے پاس رہے گا جب تک کہ یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ اسے کہاں بھیجا جائے گا۔ اس نے کہا کہ عام طور پر بچّے اپنے نانا نانی یا دادا دادی کی تحویل میں دے دیے جاتے ہیں۔

میں واقعات کے اس موڑ پر اس قدر جذباتی ہو گئی کہ تھوڑی دیر گذر جانے کے بعد ہی میں یہ دیکھ پائی کہ سپاہی نے دروازے کا روزن کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے جھانکا اور برآمدے کے پار لوئزا کی آنکھوں کی ایک جھلک دیکھی۔

(باب ۲۸)

اب مجھے معلوم ہوگیا کہ ۲۵ فروری کے اندراج کا باقی حصہ کیا ہوا۔ یہ بھید مجھے اس وقت سے تنگ کر رہا تھا جب مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ اندراج نامکمل ہے۔

کل رات مجھے ایک اور ڈراؤنا خواب دکھائی دیا، لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے اتنا صاف یاد نہیں جتنے کہ دوسرے یاد ہیں۔ اس خواب نے مجھے جسمانی طور پر چور چور کر دیا ہے اور آج اندیشہ ہوا کہ صبح کی عبادت میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوسکوں گا۔ لیکن جب میں نے کپتان، پولیس کمشنر اور دونوں جاسوسوں کے چہروں پر تسکین کے آثار دیکھے، تو میری ہمّت بڑھی اور میں نے ان خطوط پر وعظ کہنا شروع کیا: ''سیاسی بنیادوں پر اذیت رسانی کو وہ لوگ رائج کرتے ہیں جو اپنی انسانیت کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ (یونانی ڈرامہ نگار) ارستو فانس کے طربیے ''مینڈک'' کا اقتباس وہ دھرم معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق نزاج کے یہ شوقین اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ''اسے سیڑھی سے باندھ دو'' ارستوفانس نے لکھا، ''تان دو اسے، کوڑے مارے جاؤ یہاں تک کہ اس کا خون بہنے لگے، رسّی دو اسے، اس کے نتھنوں میں سرکہ انڈیل دو، کھال کھینچ لو، چھت کی اینٹیں اس کے چہرے پر چن دو، جو کر سکتے ہو اس کے ساتھ سب کچھ کرو۔''

''اور ایسا لگتا ہے کہ یہ آخری نقرہ ''اس کے ساتھ سب کچھ کرو'' آج کے قہریار ٹائبیریس کے تخیّل کے لیے مہمیز ثابت ہو رہا ہے کیوں کہ وہ پچھلی، قابل نفرین حرکتوں سے آگے جا رہے ہیں۔ آج کے یہ قہریار ٹائبیریس، خون کے پیاسے ہیں اور انہیں اندازہ ہے کہ انسانیت سوز حرکتوں کا یہ سلسلہ ان کی ہوس کو اور بڑھاتا رہتا ہے۔''

''وہ انصاف کے نام پر اذیت دیتے ہیں، قانون کے نام پر اذیت دیتے ہیں،

ملک وملّت کے نام پر اذیت دیتے ہیں اور کچھ تو اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ خدا کے نام پر اذیت دے رہے ہیں۔"

"قدیم زمانوں میں ایک رسم کے طور پر لوگوں کو اذیت پہنچائی جاتی تھی۔ اس حرکت میں ملوث لوگوں کی معصومیت یا جہالت شاید وہ واحد جواز تھا کہ اس درندگی کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن اب جب کہ انسان چاند پر پہنچ چکا ہے، اس اذیت رسانی کا جواز ہے؟ ان غیرانسانی حرکتوں کا کیا سبب ہوسکتا ہے، سوائے کج روی، کینہ، غدّاری اور دوسروں کی اذیت سے لذّت اٹھانے کی عادت کے؟"

یہ وعظ طویل تھا اور زیادہ تر اسی لہجے میں تھا۔ جوں ہی وعظ ختم ہوا، پہلی قطار کے لوگ جلدی سے رخصت ہوگئے، جب کہ روزا ارکوئیا، ماریا آر کے اور غریب بستیوں کے لوگ بیٹھے رہے یہاں تک کہ باقی لوگ سب باہر نکل گئے، تب انہوں نے اٹھنا شروع کیا۔

میں اتنے اچھے موڈ میں تھا کہ دوافروش کے گھر گیا تاکہ اس شام دعوت میں شریک نہ ہوسکنے پر معذرت کروں۔ وہ ظاہر کرتا رہا کہ ایک نسخہ تیار کرنے میں بے حد مصروف ہے جب کہ کن آنکھوں سے ذرا ذرا دیر کے بعد ان دو جاسوسوں کی طرف دیکھتا رہا جو سڑک کے دوسری طرف اس طرح ظاہر کررہے تھے جیسے وہ "لاسینٹرل" اسٹور کی کھڑکی میں سجی چیزیں دیکھ رہے ہوں۔

میں اپنے کمرے میں واپس آگیا اور روزنامچے پر کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وقت ہوگیا کہ پچھلے دن کی تحریر کی نقل روزا کے پاس لے جاؤں، جس طرح اب میں مستقل طور پر کررہا تھا۔ روزا نے مجھے بتایا کہ صبح کی عبادت کے ذرا دیر بعد ہی کپتان اپنی گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف گیا تھا، اور اسے معلوم تھا کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے اس لیے کہ وہ سارا دن اس سڑک کی نگرانی کرتی رہی ہے جو بستی کے اندر آتی ہے۔

(باب ۲۹)

۱۵ مارچ

آج صبح لوئزا نے کاغذ کے دو مڑے تڑے ٹکڑے میری کوٹھری میں پھینکے' ایک تو اخبار کا حاشیہ جس پر میں یہ لکھ رہی ہوں' اور دوسرے پر اس کا یہ پیغام درج تھا:

"سپاہی نے مجھے بتایا کہ ایلیشیا کا بچّہ بڑا پیارا ہے۔ لیکن انہوں نے بچّہ اس کے حوالے نہیں کیا' کیوں کہ بچّہ بحری افواج کے ایک لاولد کپتان کے حوالے کردینے کا وعدہ کرلیا گیا تھا۔ سپاہی کی تجویز یہ ہے کہ ہم ایلیشیا کو یہ بتائیں کہ عین وقت پر پیچیدگیاں ہوگئیں اور بچّہ پیدا ہوتے ہی مرگیا۔ یہ سارا معاملہ اس قدر ہولناک ہے کہ مجھے ایسا لگتا ہے ہمیں اس تجویز پر عمل کرنا چاہیے۔

اب ہمیں ایلیشیا کے بارے میں سوچنا ہے اور اس کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ یقین کرلے بچّہ پیدا ہوتے ہی مرگیا' اس کے بجائے کہ ان ماؤں میں سے ایک اور ماں بن جائے جو غائب ہوجانے والے بیٹوں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں۔

اگر تمہارے ذہن میں اس کے بارے میں شبہات ہیں' یہ کہ وہ ہمیں دھوکا دیتا رہا ہے اور غدار ہے ---- تو ذرا یہ سوچو: اس شخص کی بھی بری حالت ہے اس لیے کہ اسے شبہ ہوگیا ہے کہ اسے بھی استعمال کیا گیا جس وقت اس سے یہ کہا گیا کہ ایلیشیا سے خصوصی برتاؤ کرے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے اس کام کو پسند کیا' لیکن وہ اس کے ساتھ خصوصی برتاؤ ہی کرتا۔ اس لیے کہ اس کے شوہر نے ایک مرتبہ سپاہی کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ اور غور کرو کہ اس نے آدھ گھنٹے تک محنت کرکے یہ سب مجھے سمجھایا (تم جانتی ہو کہ میں صرف ہونٹوں کی حرکت پڑھ سکتی ہوں اور اس میں بھی مجھے مہارت حاصل نہیں ہے۔) ہم اس پر بھروسا کرسکتے ہیں۔ اس وقت بہادری کی پہلے سے بھی زیادہ

ضرورت ہے۔"

لوئزا کی تحریر پڑھتے ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر میں نے رو پڑنے سے انکار کر دیا۔

۱۶ مارچ

میں مر جانا چاہتی ہوں۔

مجھے لگ رہا ہے کہ میں قابل نفرت بزدل ہوں۔

چند ایک اور لوگوں کے ساتھ مجھے صحن میں لے جایا گیا' جن میں دو نئی عورتیں بھی شامل تھیں جن کے بازوؤں اور ٹانگوں پر نیل پڑے ہوئے تھے اور جمے ہوئے خون کے ٹکڑے تھے۔

کرنل اور لیفٹیننٹ پہلے سے موجود تھے جس وقت ہم وہاں پہنچے۔ ایک مرتبہ پھر قطار کی صورت دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ دیر تک کرنل فوجی انداز میں ہمارے سامنے چلتا رہا جیسے افواج کا معائنہ کر رہا ہو' پھر اچانک رک گیا۔ ایک دم سے اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا لہرایا' جسے میں پہچان گئی کہ ۲۵ فروری کے اندراج کا حصّہ ہے' اور زور سے گرجا:

"کس نے لکھا ہے یہ؟"

کسی نے جواب نہیں دیا۔ یہ ظاہر تھا کہ انہوں نے اس ٹکڑے کی تحریر ان کاغذوں سے ملا کر دیکھی ہے جو تین دن پہلے ہم سے لکھوائے گئے۔ پھر وہ سیدھے اس عینک والے کے پاس گئے' اور اس کی طرف نظریں گاڑ کر کرنل نے دہرایا:

"کس نے لکھا ہے یہ؟"

اس آدمی نے کرنل کی طرف تحقیر کی نگاہ ڈالی۔ لیفٹیننٹ نے چابک کے دستے سے اس کے چہرے کو کاٹ ڈالا' جس میں اس آدمی کی عینک ٹوٹ گئی۔

اس آدمی نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔ میں نے اس کے انگلیوں سے خون ٹپکتا ہوا دیکھا۔ لیفٹیننٹ نے دوبارہ پوچھا:

"کس نے لکھا ہے یہ؟"

اس آدمی نے چہرے پر سے ہاتھ آہستہ آہستہ بس اسی قدر علیحدہ کیے کہ لیفٹیننٹ کے منہ پر تھوک اور خون پھینک سکے۔

دو سپاہی بھاگتے ہوئے آئے اور اسے مار کر زمین پر گرادیا۔ لیفٹیننٹ نے انتظار کیا کہ اس کو ہتھکڑی پہنادی جائے اور اس دوران اپنے چہرے سے تھوک اور خون پونچھ لیا۔ کرنل اس آدمی پر چابک برسانے لگا اور اس کے سارے بدن پر اپنے نوک دار بوٹوں سے لاتیں مارنے لگا۔ میں نے ہڈی چٹخنے کی آواز سنی۔

مجھے شدّت سے احساس ہوا کہ مجھے بول پڑنا چاہیے۔ قسم کھاتی ہوں کہ میں نے بولنا چاہا۔ مگر میں کچھ نہیں بولی۔

۱۷ مارچ

ساری صبح ایلیشیا اور اس کے بچّے کے بارے میں بولنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر وہ عینک والا آدمی زیادہ تر وقت میرے اعصاب پر طاری رہا۔ اور میرے خیال میں مجھے اس بات پر بھی غصّہ تھا کہ ایلیشیا اور لوئزا میرے احساس جرم میں شریک نہیں ہیں۔

جب بھی یقین ہوتا کہ اب مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تو میں کھڑکی کے سوراخ میں سے جھانکتی۔ میں نے عینک والے آدمی کو بالکل برہنہ حالت میں، زمین میں گڑے ستون سے بندھے ہوئے دیکھا۔ عینک کے بغیر وہ کم عمر لگتا تھا۔ اس کے سارے بدن پر زخم اور چوٹوں کے نشان تھے۔

مجھے ایلیشیا اور لوئزا سے بات کرنی ہے۔ یہ آدمی ہماری وجہ سے مارا جارہا ہے۔ مجھے ان کو سمجھانا پڑے گا۔ لگتا ہے انہیں پروا ہی نہیں ہے۔ تم دیکھ رہے

ہو؟ لگتا ہے انہیں پروا ہی نہیں ہے۔

۱۸ مارچ

ایلیشیا کو باہر نکالا گیا مگر وہ میرے پاس آکر نہیں بیٹھی۔

۱۹ مارچ

ایلیشیا میرے نزدیک آکر بیٹھ گئی اور میری سمجھ میں بس یہ آیا کہ میں اس کا ہاتھ تھام لوں۔ وہ فاقہ زدہ معلوم ہوتی تھی مگر اب بھی خوبصورت تھی۔ اس نے بات چیت شروع کی مگر اپنے بچّے کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس آدمی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ کانپنے لگی۔ لیکن اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں کچھ نہیں کرسکتی۔

میں نے اس سے کہا کہ ہماری خاموشی مجرمانہ ہے' لیکن اس آدمی کے بارے میں باتیں کرنے کے بجائے وہ لیفٹیننٹ کے بارے میں کچھ بڑبڑانے لگی اور حقارت کے ساتھ زمین پر تھوک دیا۔ وہ بچّے سے محرومی کا شکار تھی اس لیے میں نے اس پر مزید زور نہیں دیا۔ وہ لیفٹیننٹ کے بارے میں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے لیفٹیننٹ کو ایک عورت کے ہاتھ کاٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کہنے لگی کہ یہ عورت بیلجیم کی راہبہ تھی جسے اس لیے اغوا کیا گیا تھا کہ اس نے غائب ہوجانے والوں کی ماؤں کو تسلی دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔

اس نے کہا کہ ایک اور صوبے کے صدر مقام کی سڑکوں پر ایک اور جنرل کو مار ڈالا گیا ہے اور اذیت رساں اس کا بدلہ لیں گے۔ پہلی دفعہ میں نے ہمّت کرکے پوچھا کہ کیا وہ ان گروہوں میں سے کسی میں شامل ہے جو حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں' اور اس نے جواب دیا کہ اس کا گناہ بس اسی قدر تھا کہ اس نے ایک ڈاکٹر سے شادی کرلی تھی جو مسلح کارکن تو خود بھی نہیں تھا' لیکن آدرش وادی تھا اور غریب بستیوں کے باشندوں کا مفت علاج کرتا تھا۔ وہ یہ بتا رہی تھی تو میں نیستور کے بارے میں سوچنے لگی۔

میں نے اس سے لوئزا کے بارے میں بھی پوچھا اور اس نے شبے کا اظہار کیا کہ لوئزا یقینی طور پر کسی مسلح گروہ سے متعلق ہوگی، مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ کس سے۔ اس کے علاوہ، اس نے مجھے بتایا کہ اس سپاہی کے کہنے کے مطابق لوئزا کو جلد ہی چھوڑ دیا جائے گا کیوں کہ اسے ناقابل علاج حد تک پاگل قرار دیا جاچکا ہے۔ وہ لوگ کسی انتہا پسند گروہ سے اس کی وابستگی طے نہیں کرسکے۔

(باب ۳۰)

آج ایک بار پھر میں نے اپنے وعظ میں جبر کے خلاف واضح حوالے استعمال کیے۔ کپتان اور اس کا ایک ایجنٹ حاضرین میں سے غائب تھے۔ اور دوافروش بھی۔

دس بجے کے قریب ڈاکٹر اورٹیز مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں اس بات سے مایوس ہوا۔ چھوٹے سے دفتر میں ایک پرانی دھرانی میز کے گرد ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے اور مطب کے بارے میں گپ شپ کرتے رہے جہاں میں پچھلے دنوں اس پابندی سے نہیں جارہا تھا جیسے کہ جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر اورٹیز مجھے خاصے تجسس کے ساتھ دیکھتے رہے اور میں نے انہیں اپنی صحت کے بارے میں بات کرنے کا موقع بھی یوں فراہم کیا کہ ان سے شدید جذباتی صدمے کے نتیجے میں لاحق ہونے والے عارضے کے بارے میں مزید تفصیلات پوچھیں۔

”میں تو کہہ چکا ہوں کہ میں مدد کرنا چاہتا ہوں“ انہوں نے کہا ”لیکن مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کس بارے میں ہے۔“

”یہ کسی کے بارے میں ہے جس کو اذیت رسانی اور ذلّت کا اس حد تک نشانہ بنایا گیا ہے کہ اس شدّت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا“، میں نے کہا۔

ان کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں اور انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری

جیسے ان پر اچانک کوئی حقیقت منکشف ہوئی ہو۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ اب تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں اپنے بارے میں بات کر رہا ہوں' اور میں نے انہیں یہی سمجھنے دیا۔

"مجھے مزید معلومات چاہئیں" انہوں نے کہا۔

"میں جو کہہ سکتا تھا' میں نے کہہ دیا" میں نے خفگی سے جواب دیا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "یہ بھی مخصوص روّیہ ہے۔"

اب مجھے دلچسپی ہونے لگی۔

"آپ کا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آدمی کے دماغ میں ایسے میکانیکی طریقے ہوتے ہیں جو ان تجربات کا سدباب کردیتے ہیں جن سے شعوری طور پر نمٹا نہیں جاسکتا" انہوں نے کہا۔

"مجھے تو سب کچھ یاد ہے" میں نے کہا اور وہ کچھ مایوس نظر آنے لگے۔

"اس مرض کی تعریف کے مطابق" ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "جو دباؤ پڑا ہو وہ اس قدر شدید ہو کہ اسے ان انسانی تجربات سے ماورا قرار دیا جائے جنہیں معمول کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔"

"کیا بحالی ممکن ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو منحصر ہے۔"

"کس پر؟"

"اس امکان پر کہ مثال کے طور پر دماغ کو کتنا نقصان پہنچتا ہے۔"

"کس چیز سے؟"

"مثلاً باقاعدگی سے بجلی کے جھٹکے لگنے پر" ڈاکٹر نے توقّف کیا اور سیدھے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "مثال کے طور پر پیکانا سے۔"

"اور کس چیز سے؟"

"ذاتی عوامل کی ایک متنوّع تعداد ہے جو اس بارے میں ایک فرد کا رجحان پہلے سے متعیّن کر سکتے ہیں کہ صدمے کے بعد وہ کس حد تک مریضانہ علامات کا شکار ہو گا۔"

"وضاحت سے بات کیجیے۔"

"چونکا کر رکھ دینے والے واقعات کے وقت اس کی عمر' دماغ کی پچھلی حالت' موروثی عوامل' معاشرتی سہاروں کی موجودگی ایسے عوامل میں شامل ہیں۔"

میں اتنے غور سے سن رہا تھا کہ غائب دماغ معلوم ہو رہا ہوں گا۔

"فادر' کسی کو بھی کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ آپ....."

"شکریہ ڈاکٹر صاحب" میں اٹھ کھڑا اور ہاتھ ملانے کے لیے ان کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے اپنی مدد کرنے دیجیے' فادر" ڈاکٹر اورٹیز نے اس قدر ملتجیانہ انداز میں کہا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"آپ کے کرنے کا کام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا' ابھی کے لیے تو میں دوا تجویز کیے دیتا ہوں کہ آپ کی بھوک کھل جائے۔ آپ کا وزن غیر معمولی طور پر کم ہو رہا ہے۔"

انہوں نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا اور کچھ لکھ ڈالا۔

"سونے سے پہلے یہ ایک گولی لے لینا" انہوں نے کہا۔

وہ گئے تو میں نے غور سے دیکھا' انہوں نے ایک معروف خواب آور دوا کا نام لکھ کر دیا تھا۔ اسی دوپہر میں دوبارہ ڈاکٹر اورٹیز سے ملنے گیا تاکہ ان کی توجّہ کا شکریہ ادا کر سکوں' اور اس کے ساتھ ساتھ ان پر یہ بھی واضح کر دوں کہ وہ

مجھے دھوکا دینے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا ان کی بیوی زار و قطار رو رہی ہیں اور کئی ایک عورتیں انہیں گھیرے ہوئے بیٹھی ہیں۔ وہ مجھ سے لپٹ گئیں اور بے حال ہو کر سسکیاں بھرنے لگیں۔

"وہ اسے لے گئے ..... وہ اسے لے گئے" وہ رو رہی تھیں۔

کچھ عورتوں نے انہیں کرسی پر بٹھا دیا اور روزا مجھے الگ لے گئی۔

"ان لوگوں نے ان کے بڑے بیٹے کو شہر میں بورڈنگ ہاؤس سے اغوا کر لیا جہاں وہ دو اور طالب علموں کے ساتھ رہتا تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ شہر چلے گئے۔ وہ دیوانوں جیسی حرکتیں کر رہے ہیں۔"

"یہ کب ہوا؟"

"تین دن پہلے، مگر انہیں کوئی گھنٹہ بھر پہلے پتہ چلا ہے۔"

میں مسز اورٹیز اور روزا کے ساتھ آدھی رات تک رہا، پھر واپس اپنے کمرے میں آگیا اور روزنامچے پر کام کرتا رہا یہاں تک کہ مجھے نیند آگئی۔

(باب ۳۱)

۲۰ مارچ۔

ایلیشیا کا خیال غلط نہیں تھا کہ جنرل کے قتل کے ردِ عمل ہو گا۔ دن میں کوئی نیا واقعہ نہیں ہوا لیکن ہمیں باہر صحن میں نہیں لے جایا گیا۔

رات ہوئی تو آوازیں آنے لگیں کہ کوٹھریاں کھل رہی ہیں، لوگ کراہ رہے

ہیں اور جسم برآمدے میں سے گھسیٹ کر لے جائے جا رہے ہیں۔ میں نے تصوّر کیا کہ وہ دبلا پتلا آدمی پلنگ سے بندھا ہوا ہے یا کنڈے سے لٹک رہا ہے۔ اس سے بدتر بات میرے تصوّر میں آئی کہ ٹین کا ڈبّا اس کے کولھوں پر باندھ دیا گیا ہے۔ میں گھبرا کر رونے لگی۔ مجھے کسی سے بات کرنا ہے۔ لیکن میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ ہر بار جب کسی کوٹھری کے کھلنے کی آواز سنتی تو کانپ کانپ جاتی، لیکن رات گزرتی رہی اور مجھے باہر نہیں نکالا گیا۔

۲۱ مارچ

صبح ہونے والی تھی کہ وہ مجھے ایک گاڑی میں لے کر آئے۔ ہم نے خاصا بڑا سفر کیا۔ مجھے کوئی بات مانوس نہیں لگی، سوائے خوف کے۔

انھوں نے مجھے گاڑی سے باہر نکالا اور کچّے راستے پر چلانے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ جگہ میرے لیے نئی ہے۔ میں نے لوہے کا ایک پھاٹک کھلنے کی آواز سنی، جس کے بارے میں، اندازہ لگایا کہ کسی رکاوٹ سے اندر جانے کا راستہ ہے۔ ہم چند قدم اور آگے چلے۔ میں نے ایک اور دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ مجھے ایک جگہ دھکیل دیا گیا جس کے بارے میں مجھے اندازہ ہوا کہ یہ چھوٹا سا کمرہ ہے۔

"اسے آپریشن روم لے جاؤ" میں نے ایک مانوس آواز کو کہتے سنا۔

وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئے اور اسی آواز نے حکم دیا کہ میرے منہ پر سے نقاب اتار دی جائے۔ جو آدمی بول رہا تھا، وہی تھا جسے میں نے اعلا لباس پہنے ہوئے دیکھا تھا اور جس نے ہم پر گولی چلائے جانے کا حکم دیا تھا جب ہمیں ننگا کر کے صحن کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اسے کرنل کہہ کر بات کی جا رہی تھی۔

یہ کسی پرانی حویلی کا کشادہ کمرہ تھا۔ اس میں لوہے کی دو مسہریاں تھیں، فرش کے بیچوں بیچ بڑی سی بالٹی، اور کنڈی والی بھاری زنجیر جو چھت سے لٹکی ہوئی تھی، جس جگہ پہلے کبھی فانوس ہوگا۔ ایک دیوار کے قریب بجلی کا کنٹرول پینل

تھا۔

جو آدمی مجھے یہاں لے کر آیا تھا وہ چلا گیا' اور وہاں پر کرنل اور وہ دو آدمی رہ گئے جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ننگا کر کے لوہے کی مسہری سے باندھ دیا گیا۔ بجلی کا تار پیر کے انگوٹھے سے جوڑ دیا گیا۔ الیکٹروڈز میری کن پٹیوں پر لگا دی گئیں۔ ایلیشیا نے مجھے بتایا تھا کہ اذیت رسانی کی اس شکل میں منہ خود بخود کھل جاتا ہے اور چیخیں نہیں نکل سکتیں۔ پھر ان میں سے ایک آدمی کنٹرول پینل پر چلا گیا اور دوسرے نے پیکانا لیک کر سنبھال لی۔

کرنل مسہری کے نزدیک آیا۔

''کیا تم میرے ساتھ تعاون کرو گی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرنل نے پیکان والے آدمی کو اشارہ کیا جو بجلی کا تار میری چھاتیوں پر لگانے لگا۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میرے منہ سے کچھ نہیں نکلا۔

''کیا تم تعاون کرو گی؟'' کرنل نے دہرایا۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ ایک بار پھر کرنل نے پیکانا والے کی طرف دیکھا۔

''میں دو گھنٹے میں واپس آؤں گا'' اس نے کہا اور چلا گیا۔

کنٹرول پینل والا اس کے ساتھ چلا گیا' پھر دو اور آدمیوں کے ساتھ واپس آیا۔ میں اسے پہچان گئی کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے پہلی جگہ مجھے اذیت پہنچائی تھی اور جس نے وہاں کئی مرتبہ مجھے ریپ کیا۔

''پچھلی بار جب اسے دیکھا تھا تو بری نہیں تھی مگر اب تو بالکل گوبر کی چھوت ہے!'' اس نے دوسروں سے کہا جو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''میں تو پھر بھی اس کی لوں گا'' اس کے ساتھ آنے والے آدمی نے کہا۔

''اور میں بھی'' پیکانا والے نے کہا۔

''اچھا تو پھر جلدی کرو' اس سے پہلے کہ کرنل صاحب لوٹ آئیں'' اس آدمی نے کہا جو پہلے یہ سب کر چکا تھا۔

''نہیں ' ہم تو مذاق کر رہے تھے'' بجلی کے تار والے نے کہا۔ ''یہ ہڈیوں کا ڈھیر بہت گھناؤنا ہے۔'' سب ہنس دیے۔

اس کے بعد سے وہ مجھے اذیت پہنچاتے رہے' کوئی سوال کیے بغیر۔ جب کرنل واپس آیا تو اس نے پوچھا کہ میں نے کچھ بتایا۔

''کچھ نہیں'' پیکانا والے آدمی نے کہا۔ کرنل پھر میری طرف آیا۔

''تمہارا دوست نیستور کس گروہ میں شامل ہے؟''

میں بے ہوش ہوئی جا رہی تھی۔

''وہ پادری انتونیو کہاں ہے؟''

میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو گاڑی کے فرش پر تھی۔ میں اب اور جینا نہیں چاہتی! ..... خدایا' اب یہی میرا انجام ہو جانے دے!

(باب ۳۲)

..... میں نے سپاہیوں کو دروازہ توڑتے ہوئے دیکھا اور اپنے ابا کو پچھواڑے کی باڑھ پھلانگتے ہوئے۔ میں ان کے پیچھے پکارتا ہوا بھاگا' ''ابا!'' اور میں نے بھی باڑھ پھلانگنے کی کوشش کی۔ عین اسی لمحے میں نے گولیوں کی آواز سنی اور میرے ابا باڑھ کی دوسری طرف اگی کانٹے دار جھاڑیوں پر گر پڑے۔ باڑھ کے تختوں میں سے میں نے ان کا خون آلود چہرہ دیکھا۔ جن سپاہیوں نے دروازہ توڑا تھا' وہ ان سپاہیوں کے ساتھ شامل ہوگئے جو مکان کے پچھلے حصّے پر پہرہ دے رہے تھے اور سب نے مل کر ان کے بے جان جسم پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔

پھر ایک آدمی آیا جو اعلا لباس پہنے ہوئے تھا اور جسے "ہمارے کرنل صاحب" کہہ کر مخاطب کیا جارہا تھا اور سپاہی ایک طرف ہوگئے۔

کرنل میری طرف اور میرے رونے کی آواز کی طرف مڑا اور باڑھ کی طرف بڑھا۔ میں چیخا، "اماّں!..... اماّں!....."

میں چیختا ہوا جاگ اٹھا "اماّں!...... اماّں!...." دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور میں نے سنا کہ جوانیتا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے اور چیخ رہی ہے "فادر!.... فادر!.... کیا ہوگیا، فادر؟"

(باب ۳۳)

۲۲ مارچ

جو واحد چیز تبدیل نہیں ہوئی، وہ باقاعدگی ہے کہ جس کے ساتھ لوئزا خالی کاغذوں کے مٹھے میری کوٹھری میں پھینکتی ہے۔ میں ان پر لکھتی ہوں اور باہر برآمدے میں پھینک دیتی ہوں۔ اس کے علاوہ، ہر ایک دن گذرے ہوئے دن سے مختلف ہے۔

صحن میں ایسے لوگ ہیں جنہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ان میں ایک بے حد کم عمر آدمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بڑی عمر کا ہو، لیکن میری کھڑکی کے سوراخ سے وہ بچہّ لگتا ہے جس کے بال گھونگھر والے ہیں اور بڑی بڑی گہری آنکھیں ہیں۔ وہ بہت کم زور ہے اور بمشکل کھڑا ہوسکتا ہے۔ سپاہی ہر بار وہاں سے گزرتے ہوئے اسے لاتیں مارتے ہیں اور وہ بچہّ سا معصومیت کے ساتھ ہر چیز کی طرف ٹکر ٹکر دیکھے جاتا ہے، جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اس کے چاروں طرف کیا ہورہا ہے۔

پتہ نہیں کیوں اس بچے کو دیکھ کر مجھے اپنی کم زوری کا خیال آتا ہے، جسمانی

کم زوری نہیں بلکہ ذہنی۔

میں بہت سا وقت یہ سوچتے ہوئے گزارتی ہوں کہ موت کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن مجھے موت کے بارے میں کیا معلوم ہے؟ ہم موت کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتے۔ اسے مہذب نہیں سمجھا جاتا۔ صرف بچّے ہی کھلے عام موت کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ بچے اور اذیت رساں۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ میں کبھی مر بھی سکتی ہوں حالاں کہ ایک کیتھولک کے طور پر مجھے حیات بعد مرگ کے انعامات کے بارے میں سکھایا گیا تھا۔ میں جینا چاہتی ہوں!

میں نے آواگون کے بارے میں سوچا اور جب ایک سپاہی جو مجھے لے جانے کے لیے آیا تھا، کہنے لگا کہ "آج آپریشن روم میں زیادہ گاہک نہیں ہیں" تو میں نے اپنے آپ کو تصوّر کیا کہ سرجن کا لبادہ پہنے ہوئے، نشتر ہاتھ میں لیے ہوئے، لیفٹیننٹ کی آنکھیں نکال رہی ہوں۔ بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا، لیکن اس لمحے انتقام کے احساس سے مجھے لطف آیا۔ یہ بدترین بات تھی۔ پھر بھی انتقام کے شیریں احساس کا اور زیادہ انتظار کرنے لگی ہوں۔

۲۲ مارچ

ساری رات میں برآمدے میں گڑبڑ کی آوازیں سنتی رہی۔

میں نے اپنی کھڑکی سے جھانکا تو معمول سے زیادہ لوگ تھے۔ ایلیشیا ان میں نہیں تھی لیکن لوئزا نے جھاڑو پر سواری گانٹھ کر قیدیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اور اپنی لنگڑی ٹانگ گھسیٹتے ہوئے سپاہیوں کو بہت ہنسایا۔ آخر ایک سپاہی نے اسے ڈانٹا کہ اتنا رولا مچایا ہوا ہے۔ وہ گیدڑ کی طرح چلانے لگی اور اپنی اچھی والی ٹانگ اس بچّی کی طرح پٹخنے لگی جس کی گڑیا چھین لی گئی ہو۔ وہ دبلا آدمی نظر نہیں آیا۔

دوپہر کے قریب لوئزا نے میری کوٹھری میں ایلیشیا کا پیغام اور کاغذ کے دو ٹکڑے پھینکے جن پر میں یہ لکھ رہی ہوں۔ ایلیشیا کہتی ہے کہ اسے خبر ہے

میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے' وہ میری پچھلی تحریر بھی پڑھتی رہی ہے۔ اس نے کہا کہ لوئزا بھی انہیں پڑھ رہی ہے۔

رات گئے وہ مجھے لے جانے کے لیے آئے اور مجھے اذیت گاہ کی طرف لے گئے۔ میرے چہرے پر سے نقاب ہٹایا گیا تو میں نے دیکھا کہ لوہے کی دو اور مسہریاں لگائی گئی ہیں ہیں۔ ان میں سے ایک مسہری پر ایک عورت تھی جس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی لیکن اس کی کھال پر وہ مخصوص ڈھیلا پن تھا جیسے بہت تھوڑے دنوں میں بہت زیادہ وزن کم ہوا ہو۔ ان دو آدمیوں کے علاوہ جو مسہریوں کے سامنے والی دیوار پر کام کر رہے تھے' ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔

وہ دونوں دیوار میں سوراخوں کے اندر لوہے کے حلقے اتار کر سیمنٹ سے بھراؤ کر رہے تھے۔ وہ عام راج مزدور لگ رہے تھے۔ ذرا ذرا دیر کے بعد وہ کن انکھیوں سے اس عورت کی طرف دیکھتے جسے پیٹوں کے ذریعے مسہری سے باندھ دیا گیا تھا۔ مجھے ذرا بھی شرم نہ آئی جب انہوں نے مجھے ننگا کر کے اس کے برابر والی مسہری پر باندھ دیا اور یہ دونوں راج مزدور دیکھتے رہے۔

تقریباً دو گھنٹے گزر گئے جس دوران اگر کوئی آواز تھی تو راج مزدوروں کے کام کرنے کی آواز اور اذیت دینے والے کی بات چیت کی دبی دبی آواز جو کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ پھر کرنل آ گیا۔ اذیت رساں اس طرف چلے گئے۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ راج مزدوروں کے کام کا معائنہ کیا اور میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس نے ان کے بیوی بچوں سے ملاقات کی ہے اور وہ انہیں مبارک باد دینا چاہتا ہے کہ ان کے گھر بار ایسے اچھے ہیں۔ پھر اس نے انہیں رخصت کر دیا۔ دونوں آدمیوں نے جلدی جلدی سامان سنبھالا اور وہاں سے چلے گئے۔

کرنل اس عورت کی مسہری کے پاس آیا اور اس سے ایک گوریلا سپاہی کے بارے میں پوچھنے لگا جو چھ ماہ پہلے شمالی صوبے کی پہاڑیوں میں مارا گیا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے نیستور سے بہت محبت ہے۔ میں کانپنے لگی۔

کرنل مسکرایا اور کچھ پوچھنے والا تھا کہ دروازہ کھلا اور سپاہی ایک قیدی کو گھسیٹتے ہوئے اندر لے آئے۔ وہ اسے خالی مسہری تک چلاتے ہوئے لے آئے اور جب اس کے چہرے کی نقاب اتاری تو یہ وہی بچّہ تھا جسے میں نے صحن میں دیکھا تھا۔

وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ تو واقعی بچّہ ہے۔ کرنل نے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اسے یہاں کس لیے لایا گیا ہے۔

"یہ یہودی ہے" سپاہیوں میں سے ایک نے جواب دیا۔

"اوہ" کرنل نے کہا۔

اور وہ اس بچّے کو مسہری سے باندھنے لگے تو کرنل اس سارے عمل کو بغیر کسی دلچسپی کے دیکھتا رہا۔

اس نے ذرا دیر تک کاروائی دیکھی پھر چلا گیا۔ اذیت رسانوں کی ہم میں دلچسپی ختم ہوگئی اور وہ بھی بچّے کی طرف چلے گئے۔ انھوں نے کوئی سوال نہیں پوچھا بلکہ تار کو اس کے ختنہ شدہ عضو پر لگاتے رہے اور دہراتے رہے "مادر چ---- یہودی، کتّا.... کتّا۔" پھر اسے مار مار کر بے سدھ کر دیا۔

جب وہ بے زار آگئے تو گاڑی میں ڈال کر ہمیں واپس کوٹھری میں لے آئے۔

گاڑی کے پچھلے حصے کے ایک کونے میں اس بچّے کی ناک اور منہ سے مسلسل خون بہے جا رہا تھا۔

میں اپنی کوٹھری کے اندھیرے میں دو زانو ہو کر جھک گئی کہ اس بچّے کے لیے اور اس دبلے آدمی کے لیے دعا مانگوں۔ اچانک میرے اندر تمام مذہبی عبادتوں بلکہ خداوند تعالیٰ کے خلاف بھی بغاوت کا ایک احساس پھوٹ پڑا۔ دعا مانگنے کے بجائے میں کوٹھری میں دیوانہ وار کاغذ ڈھونڈتی پھری۔ مجھے سگریٹ کی ایک ڈبیا ملی اور ٹشو پیپر جس پر، میں یہ دیکھ کر حیران پریشان ہوگئی کہ پہلے

ے کچھ لکھا ہوا ہے۔

میں کھڑکی کے پاس آئی اور چھوٹے سے سوراخ سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی میں پڑھا۔

وہ لوئزا کی تحریر تھی:

"میں پچھلے چند دنوں سے تمہارے تحریر پڑھتی رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کس کیفیت سے گزر رہی ہو۔ یہ احساس میرا بھی ہے۔ اور ایلیشیا کا بھی۔ اداسی اور احساس جرم نشے کے طرح حواس کو کند کر دیتے ہیں۔ رنج کھینچنے کا یہ بھی ایک مزا ہے۔ لیکن ہم ایسے تعیش کی گنجائش نہیں رکھتے۔

شاید تمہیں یہ سوچ کر کچھ فائدہ ہو کہ جو لوگ ایسے آدرش کو گلے لگاتے ہیں جس میں شدید خطرہ بھی شامل ہو' اس یقین کے ساتھ ایسا کرتے ہیں وہ زندہ رہ جائیں گے۔ کیوں کہ زندگی کی بقا ہی تو ہے' یہ سب جس کے لیے ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے بے نام بندی خانوں میں اس کے سوا کوئی قانون نہیں کہ اپنی بہترین کوشش کر کے زندہ بچ جاؤ۔

میں تمہاری بات سمجھتی ہوں۔ ایک دن تم مرجانا چاہتی ہو اور اگلے دن جینا چاہتی ہو۔ سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن آخر کار یہ دریافت کر لوگی کہ زندہ رہنے کی امنگ ہمیشہ' میں یہ لفظ دہرا دوں' ہمیشہ زیادہ طاقت ور ثابت ہوتی ہے۔

یہ تو رہا فلسفہ۔ اب جیتی جاگتی زندگی کی بات کریں۔ اگر تم بول دوگی تو تم کیا سمجھتی ہو کہ انہیں یہ اندازہ لگانے میں کتنی دیر لگے گی کہ کون کون شامل رہا ہے؟ اس کے نتیجے میں چار لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے۔

تم سمجھتی ہو کہ اگر تم نے اعتراف کر لیا ہوتا کہ وہ تمہاری تحریر ہے تو تم ایک شخص کی جان بچالیتیں۔ مگر یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ اس آدمی کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ کسی حد تک ہم سب کا ہو چکا ہے۔ لیکن تم ایلیشیا اور میں ابھی تھوڑی سی امید رکھ سکتے ہیں۔ ہم تین ہیں۔

اسے خود غرضی کہہ لو، درحقیقت، تم اسے جو بھی کہہ لو، لیکن اس میں کوئی سورما پن نہیں ہے۔ تم اپنی جان کے عوض اس کی جان کا سودا نہیں کر رہی ہو، کیوں کہ اس جگہ تمہاری جان تمہاری اپنی نہیں ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کروگی۔ تم بچ جانے والوں میں سے ہو۔ تم جینا چاہتی ہو۔ ایلیشیا بھی یہی چاہتی ہے۔ اور میں بھی۔"

میں نے دو مرتبہ اس کاغذ کو پڑھا۔ تھوڑے تھوڑے کر کے، لوئزا کے تحریر کردہ الفاظ میری سمجھ میں آنے لگے۔ کافی دیر تک میں کوٹھری کے دروازے کو تکتی رہی۔ اس نے ایک نئی معنویت اختیار کر لی تھی۔

میں پلنگ پر لیٹ گئی۔ آہستہ سے، بہت آہستہ آہستہ میں نے کاغذ کی اس گولی کو چبایا اور نگل لیا۔

مجھے اطمینان ہو گیا۔

مجھے احساس ہوا کہ میری جینے کی امنگ کو شدید نفرت جلا بخش رہی ہے۔

اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

(باب ۳۴)

بائیسویں اور تیئسویں دن کے اندراجات نقل کرنے کے دوران مجھے آدھے سر کا ایسا شدید درد اٹھا کہ میں نڈھال ہو گیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ تھک ہار کر بے چین نیند میں ڈھیر ہو جاؤں۔ وہ خواب لوٹ آتا۔ میرے ابا کو مار دیا جاتا ہے، لیکن اب میں چیختا ہوا باورچی خانے میں داخل ہوتا ہوں تو وہاں بشپ انتونیلی ہیں جن سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ مجھے سینے سے لگا لیتے ہیں، اور پدرانہ انداز میں تسلی دیتے ہوئے، جھیل کے کنارے لے جاتے ہیں۔ وہ مچھلی پکڑنے کا کانٹا نکالتے ہیں، کانٹے پر چارے کے طور پر ایک کیچوا

لگا دیتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے میں اس کیچوے پر غور کر رہا ہوں کہ وہ کس طرح پھڑک رہا ہے، پھر اسے پانی میں اچھال دیتا ہوں۔ پھر فوراً ہی کانٹے کے ساتھ ڈور تن جاتی ہے اور میں جوش کے عالم میں پیر پٹخ پٹخ کر کانٹے کو کھینچنے لگتا ہوں۔ کانٹے میں پھنسا ہوا شکار اس طرح جدوجہد کر رہا ہے کہ میں اسے باہر نہیں نکال سکتا۔ پھر وہ رک جاتا ہے جیسے ایک دم سے اس کی تمام قوّت سلب ہوگئی ہو۔

میں ڈور کو باہر کھینچ لیتا ہوں اور وہ پانی سے باہر آتی ہے تو مجھے کانٹے سے پھنسا ہوا ایک کم زور لڑکا نظر آتا ہے جس کے بال گھونگھریالے ہیں اور گہری گہری آنکھیں ہیں۔ وہ معصومیت سے میری طرف دیکھتا ہے۔ میں تسکین کے لیے بشپ کی طرف مڑتا ہوں۔ اب وہ بشپ انتونیلی نہیں ہیں بلکہ ان کی جگہ ایسا آدمی ہے جو ایک نامعلوم زبان بول رہا ہے۔ وہ مجھے سینے سے اس زور سے لپٹاتا ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں پورا زور لگا کر اپنے آپ کو چھڑاتا ہوں اور جھیل کی طرف بھاگ جاتا ہوں۔ لیکن جھیل غائب ہو جاتی ہے۔ اب اس کی جگہ وسیع میدان ہے جو سوکھے مارے بچّوں سے بھرا ہوا ہے جن کی گہری گہری آنکھیں ہیں اور وہ ایسی معصومیت سے میری طرف دیکھتے ہیں کہ میں رو پڑتا ہوں۔

میں آنسوؤں میں ڈوبا ہوا اٹھ بیٹھا اور پھر مجھ سے سویا نہیں گیا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے اور میں نے کل رات جو لکھا تھا دوبارہ پڑھا اور سوزانائے راج مزدوروں کے بارے میں اور یہودی بچّے کے بارے میں جو لکھا تھا، وہ دوبارہ سے پڑھا۔ وہ دونوں راج مزدور کبھی بھی لب کشائی کر کے انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی مذمت نہیں کریں گے۔ شاید وہ اپنی بیویوں کو بتادیں مگر اور کسی کو نہیں، کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ خاموشی بہترین حکمت عملی ہے۔ یا شاید وہ کچھ نہ کہیں اور ان کی بیویوں کو بھی کبھی نہ معلوم ہو کہ وہ ایک اور عورت کے ننگے پن سے لطف اندوز ہوئے ہیں جسے اذیت پہنچائی جانے والی تھی۔ ان راج مزدوروں کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ اس ملک

میں 'غائب' ہوجانے والوں میں سے ساٹھ فی صدی ان کی طرح مزدور اور کارکن تھے۔

مجھے معاف کرنا خدا لیکن یہ دنیا گوبر ہے!

(باب ۳۵)

۲۴ مارچ

اذیت گاہ میں پہنچنے کے بعد میں نے کرسی سے ایک آدمی بندھا ہوا دیکھا۔ اور ایک اذیت رساں اس کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ چندھیا دینے والی دو بتیاں اس کی آنکھوں پر مرتکز تھیں۔ ان دو روشنیوں کے بیچ میں کرنل کھڑا تھا۔ اس نے آدمی سے پوچھا کہ تمہارے کیا کوادروز' ہیں۔ ایلیشیا نے مجھے بعد میں بتایا کہ "کوادروز" کا مطلب ہے رابطے'۔

وہ آدمی کافی دیر سے "تیسرے درجے" کا یہ سلوک سہہ رہا ہوگا' اس لیے کہ وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں۔ اس کے پپوٹے بند ہونے لگتے تو سپاہی اس کے بال نوچ کر اسے مجبور کرتا کہ بتیوں کی طرف دیکھتا رہے۔ میں پھر اس کو نہ دیکھ سکی جب انہوں نے میرے کپڑے اتار دیے اور مجھے مسہری سے باندھ دیا' لیکن میں 'کوادروز' کے بارے میں اس سے کیے جانے والے سوال' اور 'گورنیحو' نامی کسی آدمی کے بارے میں سوال سنتی رہی' جس کا وہ گاہے گاہے اس طرح ذکر کرتے کہ وہ کسی تخریب کار تنظیم کا سربراہ ہو۔

ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ میں ایک معزز صورت آدمی کو گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے' اپنے پاس سے گزرتے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی کو گھسیٹ کر باہر نکالے جانے کی آواز آئی' تیز بتیاں بجھ گئیں اور کرنل میرے پاس آن کھڑا ہوا۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں" اس نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن میں تمہاری مدد کیسے کر سکتا ہوں اگر تم میری مدد نہیں کرو گی کہ ہم اپنی مسیحی قوم کے اصل دشمنوں کو بے نقاب کر دیں؟"

معلوم نہیں کیوں، میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"اعتراف" اس نے کہا، "بس صرف ایک اعتراف اور تم اپنے ملک کی واقعی خدمت گزار ٹھہرو گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم دوبارہ آزادی حاصل کر لو گی۔"

میں گم سم ہو کر رہ گئی۔

"اپنے والدین کا سوچو۔ کیا یہ تمہارے والدین کی زندگی کے مقابلے میں کچھ حیثیت رکھتا ہے، یہ تھوڑا سا تعاون جو میں تم سے مانگ رہا ہوں؟ یا تمہارے دوست نیستور کی زندگی کے مقابلے میں۔"

میرا سارا جسم بے جان ہو گیا۔

"نہیں!..... نہیں!....." میں چیخ اٹھی اور رونے لگی۔

کرنل نے بڑی شفقت سے میرے آنسو پونچھے اور میری پیشانی تھپتھپائی، جس طرح مجھے تسلی دیتے ہوئے میرے ابا کیا کرتے تھے۔

"تم مجھے بتا دو گی کہ فادر انتونیو کس تنظیم کے رکن ہیں، بتا دو گی ناں؟" اس نے کہا۔

میں نے اپنی آنکھوں سے التجا کی کہ میری بات کا اعتبار کر لے۔

"کسی کے بھی نہیں۔ سچ مچ وہ کسی سے وابستہ نہیں ہیں۔"

کرنل نے میرے نزدیک ترین سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ میں پیکانا لیے آگیا۔

"اس کو ماروں؟"

”نہیں“، کرنل نے کہا۔ ”یہ باغی کتیا اس بات کی مستحق ہے کہ اس کو جان سے مار دیا جائے۔“

انہوں نے مجھے مسہری پر سے کھول دیا اور سب سے دور کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

دو مرتبہ کرنل نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔ ہر مرتبہ میں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور دیوار کا گارا جھڑ کر میرے کھال پر سے چھوتا ہوا گرنے لگا جب گولی دیوار پر میرے سر کے اوپر جا کر لگی۔

آخری بات جو مجھے یاد ہے وہ ڈھیر ہو کر گرنا ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کوٹھری کے فرش پر تھی۔ میں کافی دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت پڑی رہی۔ میں بس چھت کو تکتی رہی، سوچتی رہی امّاں ...... ابّا...... نیستور۔

(باب ۳۶)

ڈاکٹر اور ٹیز آج صبح مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ روزا کے ذریعے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ تین مرتبہ شہر جا چکے ہیں اور زمین آسمان ایک کیے ہوئے ہیں کہ کسی طرح ان کے بیٹے کا سراغ مل جائے جو غائب ہو چکا تھا۔ ہم دونوں میری پرانی دھرانی میز کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے تو ان کا چہرہ پھیکا اور فاقہ زدہ معلوم ہو رہا تھا۔

انہوں نے کہا کہ وہ ذاتی طور پر مسلح افواج کے کمانڈر سے اور اپنے ایک کمشنر دوست سے بات کر کے آئے ہیں اور انہوں نے ”پروانہ حاضری ملزم“ کی درخواست بھی دائر کر دی ہے۔ انہوں نے بشپ اوانڈو سے بھی بات کی ہے۔

”مجھے ایسا لگتا ہے فادر کہ میں نے بشپ کے بارے میں غلط رائے قائم کی تھی۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ یہ کہتے رہے کہ بشپ ان مسائل کا احساس رکھتے ہیں اور انہوں نے جس توجہ کا مظاہرہ کیا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان کی قیمتی مدد پر انحصار کر سکتے ہیں۔

پتہ نہیں کیوں' میں ان سے یہ پوچھ ہی بیٹھا کہ بشپ نے کیا کہا۔ شاید میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کوئی ایسی بات کہہ دیں گے جس سے وہ متلی رک جائے گی جو مجھے محسوس ہونے لگی تھی۔

"بشپ نے کہا کہ میں نے جو اقدامات اٹھائے ہیں وہ بالکل درست ہیں۔ انہوں نے فوج کے چیپلن سے بات کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے تجویز دی ہے کہ میں میونسپل کمشنر سے قریبی رابطہ رکھوں۔ درحقیقت' ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک سپاہی اور ایک مسیحی کے طور پر کپتان کے بارے میں اعلیٰ رائے رکھتے ہیں۔"

(باب ۳ ۷)

۲۵ مارچ

اب مجھے پروا نہیں رہی کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ انہوں نے جب نیستور کا اور میرے والدین کا نام لیا تو انہوں نے اس ڈھال کو کرچی کرچی کر دیا جس سے میں اپنی روح کو بچائے رکھتی تھی۔ انہوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ اپنے پیاروں کے اٹھائے ہوئے دکھ کا سامنا کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ آج پھر وہ میرے لیے آئیں گے۔ لیکن مجھے پروا نہیں۔ میرے والدین تکلیف میں ہیں۔ نیستور تکلیف میں ہے۔

آج مجھے غسل خانے لے گئے تو میں لوئزا کے سامنے سے گزری اور مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ میں نے اس کو دیکھ لیا۔ دوپہر تک کھڑکی کے سوراخ میں سے میں نے صحن میں موجود دوسرے قیدیوں کے درمیاں ایلیشیا کو

دیکھا۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ مستقل باہر کے دروازے کی طرف دیکھے جارہی تھی' میرے آنے کا انتظار کررہی تھی۔ اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اس رات وہ پھر مجھے لے جانے کے لیے آئے۔ میں منتظر تھی۔ یہ سفر گزشتہ رات سے زیادہ طویل تھا مگر ہم اسی جگہ پہنچے۔ یہ طویل اس لیے لگ رہا تھا کہ میں وہاں پہنچنے کے لیے بے قرار تھی۔ میں تکلیف اٹھانا چاہتی تھی۔ مجھے تکلیف اٹھانا ہی تھی۔

"چلو!..... مجھے تکلیف پہنچاؤ...... کتّے کی اولادو!"

انہوں نے میرے کپڑے اتار دیے اور مجھے بستر سے باندھ دیا مگر نقاب نہیں اتاری۔ میں نے آواز سنی کہ وہ کسی جسم کو گھسیٹ کر لائے ہیں اور میرے برابر والی مسہری پر ڈال دیا۔ مجھے اس کے ہانپنے کی آواز آرہی تھی۔ پھر اذیت رساں مجھ پر جٹ گئے۔ انہوں نے سر سے پیر تک پیکانا لگائی۔ پھر کسی کند اور سخت چیز سے ریپ کیا اور بدفعلی کی' اور آخر مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہوگئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو انہوں نے میرے چہرے پر سے نقاب اتار ڈالی تھی۔ پہلی آواز جو میں نے سنی وہ میرے برابر والی مسہری پر سے ایک آدمی کے سسکیاں بھرنے کی گھٹی گھٹی آواز تھی جو دل خراش آواز میں دہرائے چلا جارہا تھا' "سوزانا.... سوزانا.... سوزانا...."

میں اس شخص کی طرف مڑی۔

وہ نیستور تھا۔

(باب ۳۸)

کوئی نصف درجن کے قریب اندراجات نقل کرنے کے لیے باقی رہ گئے ہیں۔

اس کے باوجود میں نے کل کا پورا دن اپنے کمرے اور منبر کے درمیان بھٹکتے ہوئے گذارا۔ کئی بار میں نے باقی ماندہ کاغذوں کی طرف دیکھا مگر اپنے اندر ہمت نہیں پیدا کر سکا کہ انہیں ہاتھ بھی لگا سکوں۔ کئی گھنٹے میں خدا کے سامنے دوزانو رہا، مگر میں انجام معلوم کرنے کے اپنے خوف پر قابو نہیں پا سکا۔

میں چکرایا ہوا دوافروش کے ہاں گیا۔ میں روزا اور ڈاکٹر اورٹیز کے ہاں گیا۔ میں نے غریب محلّے کی طرف رخ کیا مگر سر کا درد اتنا شدید ہو گیا کہ مجھے واپس آنا پڑا۔

میں دوبارہ روزا کے ہاں آیا اور ہم نے ماریا آر کے ساتھ کھانا کھایا۔ میں نے ذکر کیا کہ میں چند دن کی چھٹی لینے والا ہوں۔

دونوں نے کہا کہ وہ میری کمی محسوس کریں گے مگر خوش ہیں کہ میں چھٹّی کر رہا ہوں۔ وہ میری گرتی ہوئی صحت کا ذکر کرنے لگیں اور یہ کہ میں نے مشکلیں جھیلنے میں ان کی کس قدر مدد کی ہے۔

رات دس بجے میں کمرے میں آ گیا۔ میں بستر پر لیٹا ان کاغذوں کو گھورتا رہا جن کی نقل باقی رہ گئی تھی۔

..... میں نے سپاہیوں کو دروازہ توڑتے ہوئے دیکھا اور اپنے ابا کو پچھواڑے کی باڑھ پھلانگتے ہوئے۔ میں ان کے پیچھے پکارتا ہوا بھاگا "ابّا' ابّا!" اور میں نے بھی باڑھ پھلانگنے کی کوشش کی۔ عین اسی لمحے میں نے گولیوں کی آواز سنی اور میرے ابّا باڑھ کے دوسری طرف اگی کانٹے دار جھاڑیوں پر گر پڑے۔ باڑھ کے تختوں میں سے میں نے ان کا خون آلود چہرہ دیکھا۔ جن سپاہیوں نے دروازہ توڑا تھا' وہ ان سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے جو مکان کے پچھلے حصے پر پہرہ دے رہے تھے اور کئی مرتبہ ان پر گولیاں چلائیں۔

پھر ایک آدمی آیا جو چھوٹے دستے کا چابک ہاتھ میں لیے ہوئے تھا' جسے وہ لیفٹیننٹ کہہ کر پکار رہے تھے' اور سپاہی ایک طرف کو ہو گئے۔ میرے رونے کی آواز پر لیفٹیننٹ نے چہرہ میری طرف پھیر لیا۔ وہ باڑھ کی طرف بڑھنے لگا تو

میں چیخنے لگا، "سوزانا.... سوزانا.... سوزانا!" یہاں تک کہ میرے دماغ نے اپنے آپ کو حقیقت کے مطابق ڈھال لیا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔۔۔۔ تین بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ میں نے اپنا پسینہ بستر کی چادر سے پونچھا اور کچھ دیر تک کاغذوں کی طرف دیکھتا رہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں آخری بار سوزانا کے جہنّم میں اترنے کے لیے تیار ہوگیا۔

(باب ۳۹)

۲۶ مارچ

نیستور پہلے سے وہاں تھا۔ ایلیشیا بھی۔ لیفٹیننٹ اپنے چار آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔

ایلیشیا کو پہلے سے لوہے کی مسہری سے باندھا ہوا تھا۔ میرے بھی کپڑے اتار دیے گئے اور مجھے بھی مسہری سے باندھ دیا گیا تھا۔ نیستور فرش پر تھا، اس کے ہاتھوں پیروں میں زنجیریں پڑی تھیں۔

لیفٹیننٹ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ کمرے کے باہر چلے جائیں اور جب تک وہ خود نہ بلائے، باہر ہی رہیں۔ جوں ہی وہ چاروں باہر چلے گئے، لیفٹیننٹ ایلیشیا کے اوپر چڑھ گیا۔ وہ بے تاب ہوکر میری طرف دیکھتی رہی، مجھ سے التجا کرتی رہی کہ اس کی مدد کرسکوں۔ میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ میں کچھ بھی تو نہیں کرسکتی۔ کچھ نہیں کرسکتی۔ جلد ہی سارا معاملہ ختم ہوگیا۔

لیفٹیننٹ نے اپنے آدمیوں کو واپس بلالیا اور جب وہ واپس آگئے تو انھوں نے نیستور کو کنڈے سے لٹکا دیا۔ لیفٹیننٹ نے مجھ سے فادر انتونیو کے بارے میں پوچھا۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے نیستور کو لات ماری اور

اس سے بھی وہی سوال پوچھا۔ نیستور شاید کسی دوا کے اثر میں تھا۔ لیفٹیننٹ نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ سمجھ رہا تھا جو اس کے ساتھ ہونے والا تھا اور اس نے بہت لڑکھڑاتی زبان سے کہا کہ ہاں۔ انہوں نے اسے چرخی سے اوپر اٹھالیا اور پھر الٹا لٹکا کر، سر کے بل پانی سے لبریز حوض میں ڈال دیا۔ اس کا جسم پھڑکنے لگا۔ لیفٹیننٹ نے حکم دیا کہ اسے اوپر کھینچ لیا جائے اور پھر فادر انتونیو کے بارے میں وہی سوال پوچھا۔

انہوں نے دوبارہ اس کو سر کے بل پانی میں ڈال دیا، پھر نکالا اور فادر انتونیو کے بارے میں وہی سوال پوچھا۔ ایک مرتبہ، دوسری، تیسری مرتبہ۔ وہ بالکل ساکت تھا۔

"کتے کی اولاد" میں چیخ اٹھی "تم کتے کی اولاد ہو .... وہ سمجھتا ہے، نیستور ہمیشہ سمجھتا ہے، تم نے سنا، کتے کی اولاد؟"

(باب ۴۰)

بس اتنا ہی۔ میں نے سارے فرش پر چھان مارا، بستر کے نیچے بھی ڈھونڈا کہ کاغذ کا ایک آدھ ٹکڑا اور ہو، مگر کچھ نہیں تھا۔ ۲۶ مارچ کا اندراج اس روزنامچے کا آخری اندراج بن گیا۔

اگلے دو دن میرے لیے بے پناہ انتشار کے دن تھے۔ میں بے قرار ہو کر ڈھونڈتا رہا کہ کچھ تو ہو جو اس جذباتی خلا کو بھر دے جو اس روزنامچے کے اچانک ختم ہو جانے سے پیدا ہوا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بشپ اوانڈو کو خط لکھوں اور مان لوں کہ وہ میری صحت کی خرابی کے بارے میں ٹھیک کہہ رہے تھے اور ان سے درخواست کروں کہ میرے متبادل کسی اور آدمی کو جس قدر جلدی ہو سکے، بھیج دیں اس لیے کہ میں بہت بیمار ہوں۔ میں اداسی کے پاتال میں پڑا ہوا تھا۔

نئے پادری کے آنے میں ہفتہ بھر لگا، لیکن اس ہفتے میں میں نے روزمرہ کے معمولات ترک کر دیے۔ میں بس روزا کے ہاں جاتا اور ہر مرتبہ اس سے کہتا کہ میرے مسوّدے کو احتیاط سے رکھے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ ابھی یہ نامکمل ہے اور بڑے شہر جا کر میں جو کچھ لکھ سکا اسے بھیجتا رہوں گا۔

ڈاکٹر اور ٹیز میرے لیے متضاد خیالات کا سبب بن گئے۔ حالاں کہ میں ان کے بیٹے کے غائب ہو جانے کی وجہ سے ان کے لیے بے حد ہم دردی محسوس کرتا تھا، لیکن اس کا اس شدید غم سے کوئی موازنہ نہیں تھا جو میں ان دوسرے والدین کے لیے محسوس کرتا تھا جن کے بچّے بھی غائب ہوئے تھے۔ میں ان کے بارے میں اپنے اس تذبذب پر اپنے آپ کو نفرین کرتا، جو اس وجہ سے پیدا ہوا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے شامل تھے جنھوں نے منہ پھیرے رکھا یہاں تک اس بلا نے ان کے اپنے گھر کا چراغ گل کر دیا۔

میں نے کاغذ کے سارے ٹکڑے اور اصل مسوّدہ اسی ڈبّے میں رکھ دیے جس میں وہ مجھ تک پہنچائے گئے تھے اور ایک چھوٹے سے سوٹ کیس کے ساتھ انھیں اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا۔

جب نیا پادری آیا تو میں نے اس کے ساتھ پورا ایک دن گزارا اور اسے سمجھاتا رہا کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونا باقی ہے۔ میں نے سفارش کی کہ وہ روزا ارکوئیا، ماریا آر کے اور غریب بستیوں کے لوگوں کو ڈھونڈ کر ان سے ملے، مگر اس کا اس طرف رجحان نہ تھا۔ اس نے بہت ہی عمدہ کلف لگا، استری کیا ہوا لبادہ پہن رکھا تھا اور کوشش کے باوجود میں اپنے ذہن میں یہ تصویر نہیں بنا سکا کہ وہ چمچماتے جوتوں کے ساتھ غریب محلّوں کی خاک آلودہ گلیوں سے گزر رہا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی سرد مہر نیلی آنکھوں نے کبھی سنوروں، مرغیوں، کتوں اور بچوں کو کیچڑ میں گرے زخمی کبوتر کے لیے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔

اگلے دن روزا، ماریا آر کے، حوانیتا اور کچھ اور عام آدمی مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے آئے۔ حوانیتا تو مریم مجدولین کی طرح رو رہی تھی۔ اور جب

چھکڑا بس پلازا کے سامنے والے کونے پر سے مڑی تو میں نے دونوں وفاقی جاسوسوں کو یادگار کی چھاؤں سے نکل کر کپتان کے گھر کا رخ کرتے ہوئے دیکھا۔

شہر میں پہنچ کر میں بشپ اوانڈو کے پاس گیا ان کا شکریہ ادا کرسکوں کہ وہ میری بات کو سمجھ گئے۔

"فادر انتونیو" انہوں نے کہا "مجھے نہیں بلکہ تمہیں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کن حالات میں رہ رہے ہیں۔ گو کہ میں ان کے استعمال کردہ ذرائع کی توثیق نہیں کرتا لیکن میں کم از کم یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ لوگ ان نظریات کے ابطال کے لیے کچھ نہ کچھ کررہے ہیں جو کلیسا کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

بشپ اپنے آپ سے اور اپنے رویے سے بہت مطمئن تھے اور اس وقت باتونی ہورہے تھے۔

"تم نے اس بستی میں زیادہ دوست نہیں بنائے" وہ کہتے رہے "اور تم دوسری جگہوں پر بھی دوست نہیں بناسکو گے اگر لوگ تم سے ڈرتے رہے۔"

میں اس بشپ کا شرمندہ احسان نہ تھا۔

اس رات میں اس ٹوٹی پھوٹی ریل گاڑی پر سوار ہوا جو دو دن میں مجھے دارالحکومت لے جائے گی جہاں پیٹریاک انتونیلی میرے منتظر تھے۔ میں جس ریل میں سوار ہوا وہ عام لوگوں سے بھری ہوئی تھی جو کپاس کے کھیتوں کی جلتی دھوپ سے بچ کر بھاگ رہے تھے کہ کپڑا ملوں کے گھن چکر میں اپنے آپ کو گرائیں۔

وہ چوڑے چھجے والی ٹوپیوں کے نیچے سے حیران پریشان ہوکر مجھے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کوئی کیا کہہ سکتا ہے اس سفید فام پادری کے بارے میں جس نے دو دن میں منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا اور گتے کا ایک ڈبا دبوچ کر سینے سے لگائے رہا' اس وقت بھی جب وہ اونگھ گیا اور اس کا سر کھڑکی سے جاٹکرایا۔

(باب ۱۴)

مونسینو را نتونیلی میری حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"انتونیو تم قبر کے مردے معلوم ہو رہے ہو۔"

انہوں نے اصرار کیا کہ میں فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔ مین نے ان کو بتادیا کہ وہ جب تک میری بات نہیں سن لیں گے میں کسی سے نہیں ملوں گا۔

ہم دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے اور انہوں نے مزید تین گھنٹے ' اپنے دفتر کے ایک کونے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر مسوّدہ پڑھنے میں لگائے۔ میں وہاں بس یوں ہی بیٹھا رہا۔

دو مرتبہ ان کے سیکرٹری نے بیچ میں آکر کسی کام کے لیے کہا' اور تیسری مرتبہ انہوں نے بڑے اخلاق کے ساتھ اس سے کہہ دیا کہ جب تک میں نہ کہوں کوئی یہاں نہ آئے۔ جب وہ فارغ ہوگئے تو کافی دیر تک ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتے رہے۔

"آؤ دوپہر کا کھانا کھالیں" انہوں نے کہا۔

"اب تو تین بج گئے ہیں حضور والا" میں نے انہیں یاد دلایا۔

"تو آؤ پھر دوپہر کا اور رات کا کھانا ملا کر کھالیں" انہوں نے اپنے سیکرٹری کو بلا کر کہا کہ وہیں دفتر میں تمام انتظام کر دے۔

"تمہیں پوری طرح بحال ہونا چاہیے۔ تم کچھ عرصے تک فادر مارٹن اور فادر ارنستو کے ساتھ رہو گے" انہوں نے شفقت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں یہ الفاظ سننے کے لیے نہیں آیا تھا۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس

مسوّدے کے بارے میں کیا کریں گے۔

"سب کچھ' میرے پیارے انتونیو" انہوں نے جواب دیا۔ "جو کچھ بھی ایک انسان کے لیے ممکن ہے۔"

وہ اٹھے' مسوّدہ لوہے کی الماری میں مقفّل کیا اور مجھ سے کہا کہ جب تک وہ واپس نہ آجائیں' وہیں ان کی آرام کرسی پر ایک نیند لے لوں۔ انہیں اندازہ ہوگیا کہ میں کچھ کہنے والا ہوں اور نرم مگر پرزور لہجے میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کی واپسی تک دفتر سے کہیں نہ جاؤں۔

وہ رات دس بجے کے بعد واپس آئے اور ایک عدد پتلون میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ فی الحال پادریوں والا سفید لبادہ استعمال نہ کروں۔

"چلو چلیں" میں تیار ہوگیا تو انہوں نے کہا۔

ہم ایک پرانی گاڑی میں بیٹھ گئے اور وہ شہر کے بیچوں بیچ سے گاڑی چلاتے ہوئے ایک مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے۔ ہم ایک پرانے گرجاگھر کے مکان کے سامنے رک گئے اور وہاں فادر مارٹن اور فادر ارنستو سے میری ملاقات ہوئی۔ مونسینور انتونیلی نے یہ کہہ کر ان سے ملوایا کہ یہ "ہمارے لوگ" ہیں' اور ان سے کہا کہ "میں تمہارے حوالے اپنا ایک بیٹا کر رہا ہوں۔"

انہوں نے ان دونوں سے کہا کہ مجھے زبردستی کھانا کھلائیں۔ انہوں نے مجھے آرام کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر مجھ سے ملنے آئیں گے۔

پہلے تین دن تک فادر ارنستو اور فادر مارٹن نے توجہ اور مہربانی سے بوجھوں مار دیا' حالاں کہ میں رات میں تین تین مرتبہ اپنے چیخنے سے ان کی نیند خراب کر دیتا تھا۔

دارالحکومت آنے کے چار دن بعد' سوزانا کے والدین سے ملنے جانے کا ارادہ میرے ذہن پر خبط کی طرح سوار ہوگیا۔ چوں کہ بشپ انتونیلی نے مجھے کسی ایسے کام کے کرنے سے منع کر دیا تھا جو جذباتی دباؤ کا موجب ہو' اس لیے

مارٹن اور ارنستو کو قائل کرنا آسان نہ تھا کہ مجھے جانے دیں۔ لیکن میری ضد کے آگے وہ مان گئے، اس شرط پر کہ میں سہ پہر تک واپس آجاؤں۔

مارٹن نے مجھے شہر کے اس حصے کے بارے میں ہدایت دیں جہاں سوزانا کے والدین رہتے تھے۔ مجھے دو بسیں بدلنی پڑیں اور دوسری بس نے مجھے جہاں اتارا اس سے تین سڑکیں پار کرنے کے بعد میری منزل تھی۔

ایک متمول رہائش علاقے میں دو رویہ درختوں والی سڑک پر چلتا رہا اور ایک گھر کے سامنے رک گیا جس کے چاروں طرف باغ کے گرد باڑھ تھی۔ جنگلی بوٹیاں پھیلی ہوئی تھیں اور پھولوں کے گملوں کو بہت دن سے دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس مکان پر ویرانی طاری تھی اور میں نے سوچا کہ کہیں سوزانا کے والدین اسے چھوڑ کر چلے تو نہیں گئے۔ رنگ اکھڑے پھاٹک کے قریب اطلاعی گھنٹی تھی لیکن جب میں اسے کئی مرتبہ بجاتا رہا اور کوئی نہ آیا تو میں نے پھاٹک کو دھکیل کر اتنا کھول دیا کہ میں اندر جاسکوں اور مکان کے دروازے پر آگیا۔ پڑوس کی دو عورتیں سڑک کے دوسری طرف سے بہت تجسس کے ساتھ میری ان تمام حرکتوں کو دیکھ رہی تھیں۔

میں نے دو مرتبہ دستک دی۔ دروازہ اچانک تھوڑا سا کھلا اور بکھرے ہوئے سفید بالوں والا سر نمودار ہوا۔ پہلے پہل مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ سوزانا کی ماں ہے۔ وہ ایک لمحے تک مجھے تکتی رہی۔

"فادر انتونیو" آخر کار اس نے کہا اور دروازہ پورا کھول دیا، پھر مجھے اس طرح لپٹا لیا جیسے میں بچھڑا بیٹا ہوں اور مدت بعد گھر آیا ہوں۔

وہ مجھے اندر کے کمرے میں لے گئی اور کرسی پر بٹھایا۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے بیٹھے رہے۔ جس باوقار اور ہنستے والی عورت کو میں جانتا تھا، وہ بجھ سی گئی تھی۔ وہ اس قدر دبلی ہوگئی تھی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی اور ایسا لگتا تھا جو شکن آلود اسکرٹ پہنے ہوئے ہے، کئی ہفتوں سے یہی پہن کر سوتی رہی ہے۔ اس کے باوجود، یہ سوال اسی نے پوچھا:

"کیا آپ بیمار ہیں، فادر؟"

"نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک دوسرے سے کیا کہیں۔

"اور آپ کے شوہر؟"

اس نے ہاتھوں سے منہ چھپالیا اور انگلیوں کے بیچ میں سے جواب دیا:

"اپنی اسی جگہ پر بیٹھے ہیں۔"

"کون سی جگہ؟"

"آرام کرسی پر، مرتبان کو تکتے ہوئے۔ سارے وقت اسی مرتبان کو تکتے ہوئے۔"

میں نے انہیں تسلی دی اور میرا رونے کو جی چاہنے لگا۔ بے چاری، سوزانا کا غائب ہوجانا ان کی برداشت سے باہر تھا۔

"جو کرسکتے تھے ہم نے کیا، فادر۔ عدالت میں درخواستیں دیں، انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی جتنی تنظیموں کے نام معلوم تھے ان کو خط لکھے، وزیروں، پادریوں بلکہ صدر مملکت تک کو خط لکھے۔"

وہ ٹھہر گئیں۔

"اور نیستور فادر۔ نیستور بھی غائب ہوگیا۔"

میں نے ان کی طرف سے منہ پھیرلیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ میرا دل گردہ نہیں تھا کہ ان سے کچھ کہہ سکوں۔

"آیئے دعا مانگیں۔"

ہم صوفے کے پاس دوزانو ہوگئے اور خدا کے حضور دعا مانگنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے ان کو سہارا دے کر اٹھایا اور کہا کہ میں ان کے شوہر سے

مانا چاہتا ہوں۔ وہ خاموشی کے ساتھ مجھے برآمدے سے گزارتے ہوئے مکان کے پچھلے حصّے میں لے آئیں جہاں مجھے یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک چھوٹی سی تجربہ گاہ بنا رکھی تھی جو انہوں نے بہت فخر کے ساتھ دکھائی تھی جب میں یہاں آخری بار آیا تھا' نیستور اور سوزانا کی منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے۔

دروازہ کھلا تو بہت دیر سے بند رہنے والے کمرے کی باسی بو پھیل گئی۔ شیشیاں اور ٹیسٹ ٹیوب گرد سے اٹے ہوئے تھے اور فرش پر کافی دن سے جھاڑو نہیں دی گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب آرام کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کی نظریں سامنے رکھے مرتبان پر گڑی ہوئے تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تب بھی انہوں نے کوئی حرکت نہ کی۔

جو مرتبان ان کی توجّہ کا مرکز بنا ہوا تھا' وہ کسی گاڑھے اور خون آلود سیّال سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں کوئی ایسی چیز تھی جو پہلے پہل میری سمجھ میں نہیں آئی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے سوزانا کی ماں سے پوچھا۔

"دکھاؤ اسے' دکھادو اس کو" اس سے پہلے کہ وہ عورت جواب دے پاتی' سوزانا کے والد اپنی اس ساکت حالت سے نکل آئے۔

"نہیں 'ایدوارڈو' خدا کے لیے نہیں!" وہ گڑگڑانے لگی۔

میں میز کی طرف گیا' مرتبان اٹھایا اور اس کا معائنہ کیا۔

میں اور بھی حیران رہ گیا جب اس کے اندر سے دھات کی کسی چیز کے مرتبان کے شیشے سے ٹکرانے کا چھناکا سنا۔ مرتبان میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ میں قے کرنے والا تھا۔

اس کے اندر دو ہاتھ تھے جنہیں کلائی کے پاس سے کاٹا گیا تھا۔ ایک ہاتھ کی بیچ والی انگلی پر انگوٹھی تھی۔ وہ دونوں اس خون آلود سیّال میں تیر رہے تھے

جیسے کسی ہولناک رقص کی حالت میں ہوں۔اس انگلی پر جو انگوٹھی تھی، وہ سوزانا کی منگنی کی انگوٹھی تھی۔

اختتامیہ

جناب عمر ریوایلا

نیویارک' نیویارک

محترم جناب ریوایلا'

فادر انتونیو نے مجھ سے کئی مرتبہ آپ کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ یاد ماضی کے ساتھ آپ کا حوالہ یوں دیا کرتے تھے کہ "وہ عقائد پر شک کرنے والا جس میں حسِ مزاح ہے جو میرے بارے میں کہا کرتا تھا کہ وہ ایک انسان کے طور پر میری کیفیت کی وجہ سے میرا احترام کرتا ہے' باقی تمام باتوں کے باوجود۔"

بہرحال' منسلکہ مسوّدے کو پڑھ کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں کون ہوں۔

فادر انتونیو آج کل وفاقی ادارہ برائے ذہنی صحت کے اسپتال میں داخل ہیں' جمہوریہ کے دارالحکومت میں' جہاں مجھے ہفتے میں ایک مرتبہ ان سے ملنے کی اجازت ہے۔ بڑے دکھ کے ساتھ میں آپ کو اطلاع دے رہی ہوں کہ سسٹر ٹریزا' جو ایک راہبہ ہیں اور جنھوں نے فادر انتونیو کی دیکھ بھال اپنے ذمّے لے لی ہے' یہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ دن بہت قریب آگیا ہے جب خداوند تعالیٰ فادر انتونیو کو اپنے پاس بلالے گا۔

فادر مارٹن اور فادر ارنستو نے مجھے تفصیلات اور واقعات بتائے ہیں جن کے نتیجے میں اسپتال میں ان کا داخلہ ضروری ہو گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سے وہ سوزانا کے والدین کے ہاں سے واپس آئے تھے' فادر انتونیو انھیں رات بے رات کسی وقت بھی جگا دیتے اور زور زور سے جھنجھوڑنے لگتے۔

فادر انتونیو سو نہیں پائے۔

ان لوگوں نے اس حالت کا سبب اس تیز بخار کو قرار دیا جس میں وہ ان دنوں مبتلا تھے اور ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے اسپرین اور مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

اس دوپہر بخار کا زور ٹوٹ گیا اور وہ اطمینان سے لیٹے رہے۔ ان کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ اب ان سے وہ خبر نہ چھپائی جائے جو دو دن پرانی ہو چکی تھی۔ بشپ انتونیلی گاڑی کے ایک پراسرار حادثے میں ہلاک ہو گئے۔

فادر مارٹن اور فادر ارنستو کا کہنا ہے کہ یہ سننے کے بعد فادر انتونیو قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور کئی گھنٹے تک بے قابو ہو کر مسلسل ہنستے چلے گئے۔

ڈاکٹر کو دوبارہ بلوایا گیا اور اس نے تجویز کیا کہ فادر کو ذہنی صحت کے ادارے لے جایا جائے' جہاں وہ اب ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش بھی ہوتے ہیں کیوں کہ وہ ہر چیز کو بغیر کسی تاثر کے گھورتے رہتے۔

بعض مرتبہ وہ ایسے نام یا الفاظ بڑبڑاتے ہیں جنہیں صرف میں ہی سمجھ سکتی ہوں: وہ اس مسودّے میں سے ہیں۔

میں پچھلی بار گئی تھی تو ہم اسپتال کے صحن میں بنچ پر بیٹھے تھے تو جیسے ان کے ہوش وحواس لوٹ آئے۔ ان کا چہرہ زندگی سے کس قدر بھرپور تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھ تھام لیے' بالکل ویسے جس طرح وہ مجھے تسلّی دیتے ہوئے کیا کرتے تھے اور کچھ الفاظ ادا کیے جو میری سمجھ میں نہیں آئے۔

پھر انہوں نے قمیص کی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا جو انہوں نے اس آخری ملاقات کے لیے تیار کر رکھا ہوگا۔ وہ انہوں نے مجھے دے دیا اور پرجوش لہجے میں کہا "اسے 'اسے ہی بھیج دو۔" اس کاغذ کے ٹکڑے پر آپ کا نام اور پتہ درج تھا۔

خلوص کے ساتھ

روزا ارکوئیا

خون جم رہا ہے آنکھوں میں

شرکائے گفتگو:

پروفیسر سید ہارون احمد

انورسن رائے

آصف فرّخی

ناممکن کی سرحد پر بسنے والے شہر میں خرابی کی ایک نئی صورت سامنے آئی۔ پچھلے دنوں چشم تماشا نے کتنے ہی نوجوانوں کو شدید جسمانی اذیت کا نشانہ بن کر ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا۔ ترقی پذیر ملکوں کے بڑھتے پھیلتے، دھرتی نگلتے شہروں کو درپیش مسائل کی طویل فہرست .... آبادی کی کثرت، جگہ کی قلت، دولت اور غربت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، فضائی آلودگی، روایتی اقدار کی شکست اور تنہائی کے مارے اجنبیوں کی یلغار، جرائم خصوصاً سماجی بدعنوانیوں کی افراط و تفریط ...... یہ سب میرے شہر کے لیے روز کا قصہ ہے۔ مسائل کی بہتات نے تو اب ایک مستقل بحران کی کیفیت اختیار کرلی ہے جس نے منظم گروہوں کے وسیع پیمانے پر کیے جانے والے جرائم، سیاسی تشدد اور شہری ابتری کی کتنی ہی صورتوں کو جنم دیا ہے۔ ان ہی میں ایک صورت یہ بھی ہے ..... کوڑے کے ڈھیر یا کسی اور سنسان مقام پر پڑی ہوئی لاش جس پر اذیت پہنچائے جانے کے واضح نشانات کے علاوہ کوئی اور شناخت نہیں۔ اوسط عمر ۲۰ سے لے کر ۲۵ سال۔ یہ لاش مقامی اخباروں میں اتنی فراوانی سے نمودار ہوئی ہے کہ کراچی کے بیش تر شہریوں نے اس کی گنتی بھی بھلادی ہے۔ یہ لاش سارے شہر کے

سامنے زبانِ حال سے دہرا رہی ہے..... وجہ بے گانگی نہیں معلوم۔

ایک مجسم سوال ہے یہ لاش۔ اسی سوال کے کربِ مسلسل نے مجھے یہ کتاب یاد دلائی۔ ۱۹۸۷ء میں جب یہ کتاب پہلی بار پڑھی تھی تو خود اطمینانی کے ساتھ سوچا تھا کہ یہ کتاب پاکستان سے بہت بعید ہے' اور اس کی زبان و اسلوب کا مترادف بھی ہمارے ہاں موجود نہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوبت یہ آگئی کہ درد و اذیت' قید اور سیاسی جبر کی یہ زبان ہمارے اخباروں تک پہنچ گئی۔ اپنے شہر کی بپتا کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش مجھے اس کتاب کے ترجمے کی طرف لے آئی۔ میرے لیے اس کتاب کی اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس پس منظر کا حوالہ بھی اہم ہے'جس میں اس کا اردو ترجمہ مجھ سے بن پڑا۔

یہ ناول ''دور کہیں'' اور ''شاید'' کا معاملہ نہیں معلوم ہوتا۔ ایک عجیب اور ہولناک مانوس پن محسوس ہوا اس کو ترجمہ کرتے وقت۔ ایک عورت کے اس نوحے میں کراچی سے اٹھنے والی چیخیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ اذیت اور ستم کی جو داستان اس ناول میں بیان کی گئی ہے' وہ ایسا لگتا ہے کہ اسی شہر کی گلیوں' محلوں میں بسنے والی لوگوں پر آتشیں ہتھیاروں سے زخم زخم داغ دی گئی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے' یہ کیا ہے' اس کا سبب کیا ہے۔ یہ سوال دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی پریشان کرتا رہا ہے اور یہی جستجو اس ترجمے کا محرک بنی کہ اذیت رسانی کی یہ ہولناک صورتیں جو اس وقت ہمارے معاشرے میں عام ہوتی جا رہی ہیں' تو یہ کیا ہو رہا ہے' یہ کیوں ہو رہا ہے' اس قسم کے واقعات کی کیا معنویت بنتی ہے اس معاشرے کے لیے اور خود ہمارے لیے۔

یہ ترجمہ اور اس میں مضمر یہ سوال میں نے پہلے پہل دو لوگوں کے سامنے رکھا۔ ممتاز معالج' پروفیسر سید ہارون احمد' جنھوں نے ذہنی صحت اور معاشرتی عوامل کے حوالے سے متعدد مباحث اور گفتگوئیں منعقد کروائیں' ان سوالات پر خود بھی غور کیا اور دوسروں کو بھی دعوت فکر دی۔ ممتاز ادیب اور صحافی جناب انور سن رائے ایک اخبار کے مدیر کی حیثیت سے ان سوالات اور ان کے مضمرات سے روز ہی الجھتے رہتے ہیں' لیکن آج سے چند برس پیش تر ان کے

ناول ''چیخ'' نے ریاستی جبر اور اذیت رسانی کے مسئلے کو اجاگر کیا تھا۔ میں آپ دونوں اصحاب کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر اس سوال کے مضمرات تلاش کرنے میں میرا ساتھ دیا۔

انور سن رائے : بات یہ ہے کہ یہ اب سے نہیں ہے۔ ویسے تو ہمارے ہاں اس کی بہت ساری پرانی شہادتیں بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔ ایوب خان کے مارشل لاء میں لاہور کے شاہی قلعے کو تشدد کے لیے استعمال کیا گیا۔ مجموعی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ جہاں جہاں بھی جمہوری یا بنیادی حقوق سے تجاوز کیا جاتا ہے' ان کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس طرح کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ خاص طور پر پنڈی سازش کیس اور اس دوران جو کچھ ہوا ایک سیاسی پارٹی کو ختم کرنے کے لیے اور جو کچھ بھی ان کا مؤقف تھا اس کو اپنا اظہار پانے سے روکنے کے لیے' تو اس وقت تمام ذرائع ابلاغ خصوصاً پریس کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا' اس پر پابندیاں لگائی گئیں۔ اس کے بعد یہ صورت حال بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہے ضیاء الحق کے دور میں' اور سندھ میں خاص طور پر جو کچھ ہوا ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران۔ اب جو سلسلہ ہے وہ تمام ان ممالک سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے جہاں جہاں بھی بنیادی انسانی حقوق سے تجاوز کیا گیا' ان کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی اور جمہوری حکومتوں کی جگہ ایسی حکومتیں برسراقتدار آئیں جو سویلین نہیں تھیں۔ ایسی حکومتوں کے جو مقاصد ہوتے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے وہ براہ راست تصادم کی صورت بھی اختیار کرسکتی ہیں پریس اور دوسرے میڈیا کے ساتھ۔ کیوں کہ تیسری دنیا کے ممالک میں الیکٹرونک میڈیا کو کنٹرول کرنا حکومت کے لیے زیادہ آسان ہوتا ہے اور وہاں اس طرح کی چیزوں کا اظہار بھی نہیں ہوپاتا۔ لے دے کے پرنٹ میڈیا رہ جاتا ہے۔ تشدد سے پیدا ہونے والی صورت حال اور اس کے جو اثرات لوگوں پر مرتب ہوتے ہیں' پرنٹ میڈیا ہی میں ان کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے معاشرے کا یہ حصّہ بار بار تشدد کا نشانہ بنتا ہے۔

آصف فرّخی : انور صاحب' یہ بات تو درست ہے کہ ہمارے ہاں تشدد اور

لوگوں کو اذیت دینے کی پوری ایک تاریخ ہے، سزاؤں کی باضابطہ ایک روایت ہے اور حکومت کا یا ریاست کا جبر بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اذیت پہنچانے والے بالعموم رائے عامہ سے یا میڈیا سے خائف ہو کر یہ کام قلعوں کی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے چوری چھپے کرتے رہے اور اپنی Face Saving کے لیے اس کو کچھ اور نام دیتے رہے۔ اب یہ کام کھلے بندوں ہو رہا ہے۔ اور لوگوں کو اذیت پہنچانے پر صرف حکومت کی یا ریاست کی اجارہ داری نہیں رہی بلکہ بعض سیاسی جماعتیں اور دوسرے گروہ بھی یہ کام کرنے میں برق ہیں اور شہر کا عام آدمی اگلے دن اخبار میں چھوٹی سی خبر پڑھتا ہے کہ فلاں مقام سے نامعلوم شخص کی لاش ملی جس کے جسم پر اذیت رسانی کے نشانات تھے۔ تو یہ تشدد وبائے عام ہوتا نظر آرہا ہے۔ اذیت رسانی شہری زندگی کے عام خطرات میں سے ایک بنتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بجائے خود کتنی ہولناک بات ہے!

انور سن رائے: دیکھیں، بنیادی طور پر تشدد جو ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر صاحب زیادہ بہتر طور پر اس کے بعض عوامل بتا سکتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی عوامل جو ہوتے ہیں، یہ میرے خیال میں بہت اہم ہیں اور ان کے ساتھ ہی ان اقتصادی عوامل کو بھی شامل کرتا ہوں جو انسان کو تشدد پر اکساتے ہیں۔ تشدد کی یہ جو نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے، بالکل اچانک یا کسی فوری چیز کا نتیجہ نہیں ہے، میرے خیال میں۔ بلکہ جب ریاستی تشدد کا آغاز ہوتا ہے تو لوگوں کے اندر بھی یہی رجحان اس کے جوابی ردعمل کے طور پر پیدا ہونے لگتا ہے۔ جو ہم بوتے ہیں وہی کاٹتے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ریاستی عمل بھی لوگوں کی پوری نفسیات کی کایا کلپ کرتا ہے۔ اور وہ اسی طرح کے طرز عمل کو واحد حل کے طور پر شاید قبول کرنے لگتے ہیں یا اسی کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی صورت حال ہمارے ہاں ہے کہ جب ایم آر ڈی کی تحریک چلی تو تشدد کے جواب میں تشدد ہی پیدا ہوا۔ اسی طرح اب جو ہمارے ہاں صورت حال پیدا ہوئی ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا کہ لاشیں ملتی ہیں جن کو وحشیانہ طریقے سے ٹارچر کیا گیا ہے، جسم کے مختلف اعضاء کٹے ہوئے ہیں، خراشیں ہیں

کہ جگہ جگہ بلیڈ سے کاٹا گیا ہے یا باندھ کر ان کو مارا گیا ہے، سگریٹوں سے جلا گیا ہے یا ڈرل سے سوراخ کیے گئے ہیں یا لاشوں کو پورا جلا کر پھینک دیا گیا ہے، یہ سارے واقعات ہمارے ہاں رونما ہوئے ہیں جو آج سے پانچ سال یا سات سال پہلے نہیں ہوتے تھے۔ پہلے جو تشدد تھا اس کی نوعیت اور تھی۔ یہ نہیں کہ موجود نہیں تھا۔ موجود ضرور تھا۔ لیکن اس کا زیادہ تر اظہار دیہی علاقوں میں ہوتا تھا اور جاگیردارانہ نظام کے اثر سے ہوتا تھا۔ اقتصادی اور سماجی نوعیت تھی اس تشدد کی۔ شہری علاقوں میں اس کے اظہار کی یہ صورت خالصتاً سیاسی صورت حال سے پیدا ہوئی ہے۔ جب لوگوں کے پاس انصاف کے حصول اور انصاف تک رسائی کا کوئی اور راستہ باقی نہیں رہ جائے گا، اور ان کو کہیں بھی اظہار کا موقع نہیں دیا جائے گا تو ریاستی جبر کے جواب میں ان کے اندر بھی ایک تشدد پیدا ہوگا۔ پھر کون کس کے خلاف کیا کرتا ہے، اس کی خاصی لمبی ایک تفصیل ہے۔ اس کے عوامل ہیں۔ ان کی اپنی جگہ کا تعیّن کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جو ریاستی تشدد ہے، بنیادی طور پر وہی اس کا سبب بنتا ہے۔

آصف فرخّی: یہ تو اس کا سبب ہوگیا۔ لیکن جس وقت یہ طریقہ معاشرے میں رواج پانے لگے تو اس وقت معاشرے میں کیا شکست و ریخت ہوتی ہے۔ جس معاشرے میں یہ اظہار کا یا سیاسی و سماجی عمل کا طریقہ بننے لگے، اس معاشرے کے افراد پر کیا گزرتی ہے۔ میں تو اس سوال سے پریشان ہوں۔

انور سن رائے: نہیں، بالکل ...... اس سوال پر خاص طور میری جو سوچ رہی ہے، وہ یہ کہ آخر انسان ہی ہے، جس کے بارے میں ہمارا، یا کم از کم میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس کے اندر ہمیشہ بہتری کی طرف جانے کے عوامل زیادہ طاقت ور طریقے سے موجود ہوتے ہیں، اس انسان کے اندر اچانک کون سی چیز پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ حیوانیت کی شکل پر چلا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی اسی زندگی کا حصہ تو رہتا ہے۔ ہمارے ہاں جتنے تشدد کرنے والے ریاستی اداروں میں شامل لوگ ہیں، وہ کسی نہ کسی خاندان کے فرد ہوتے ہیں، وہ کہیں نہ کہیں باپ بھی ہوتے ہیں، کسی کے بیٹے بھی ہوتے ہیں اور کسی خاندان کے

سرپرست بھی ہوتے ہیں اور محبت بھرے رشتے بھی ہوتے ہیں ...... جیسے اسی کتاب میں ہے کہ وہ ایک عورت پر تشدد کررہا ہے' اس کو ریپ بھی کررہا ہے اور اس کی شرم گاہ میں کرنٹ لگا کر جھٹکے بھی دے رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو یہ بھی بتا رہا ہے کہ میری بیٹی نظمیں لکھتی ہے اور میں تمہارے اسکرٹ میں یہ نظمیں رکھ رہا ہوں' تم جب واپس جاؤگی تو یہ نظمیں پڑھ لینا۔ یہ ایک عجیب و غریب متضاد قسم کی کیفیت ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: اصل میں تو تشدد اور اذیت رسانی کی اپنی ایک تاریخ ہے اور اب جب کہ حقوق انسانی کی بات کی جانے لگی ہے' تو اور جگہ تو اس میں شاید کمی آئی ہو۔ اس لیے کہ میڈیا اور خبررساں ذرائع ہیں' قوانین ہیں۔ لیکن تیسری دنیا میں' جیسا کہ انور سن رائے صاحب نے کہا ہے' جمہوری حکومت کے عام نہ ہونے کی وجہ سے وہاں حکومت کا جو بات منوانے کا طریقہ ہے یا لوگوں کو تابع کرنے کا طریقہ ہے' وہ اذیت رسانی ہے۔ اس کے مقاصد کیا ہیں' اس پر تو میں بعد میں گفتگو کروں گا' لیکن یہ جو آپ کا سوال تھا کہ ہمارے معاشرے میں ایسی چیز ہورہی ہے کہ لاش ...... تصویر ...... اخبار میں خبر...... اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ پچھلے دس پندرہ سال اگر دیکھیں ...... وہ پود' وہ بچے جو ایک خاص طرح کے حالات میں' ایک خاص دور میں جوان ہوئے ہیں۔ دس پندرہ سال اگر ذہن میں رکھ لیں تو پچھلے دنوں جو تشدد کے واقعات رونما ہوئے ہیں اس کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ تشدد' Violence Learned ہے۔ جو تشدد ہمارے ہاں رائج رہا ہے' وہ صرف اتنا ہی نہیں کہ تشدد کیا گیا ہے لوگوں پر' بلکہ اس کی تشہیر بھی اس طرح کی گئی ہے' خاص طور پر ضیاء الحق کے زمانے میں ...... ایک تو یہ سبق سکھایا گیا ہے مارشل لاء کے زمانے میں' کہ طاقت بندوق کی نالی سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی حکومت کررہے ہیں لوگوں پر تو اس طرح نہیں کہ کوئی پروگرام ہو' بلکہ اس لیے چوں کہ ان کے پاس ہتھیار ہیں' بندوقیں ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نسل نے یہ سیکھا ہے کہ طاقت ہی واحد طریقہ ہے' نہ یہ کہ منطق' نہ یہ کہ انسانی حقوق۔ تو جب یہ چیز ہوئی تو ان بچوں نے یہ سیکھا ہے کہ اپنی بات منوانے کے لیے کیا

طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ بندوق اس کی علامت ہے۔ منطق سے، یا حقائق سے یا اعداد و شمار سے یا گفتگو سے اپنی بات دوسرے تک پہنچائی جائے، یہ طریقہ نہیں رہا ہے ہمارے ہاں پچھلے دس پندرہ سال سے۔ یہ پود جو بڑھی ہے تو عام طور سے یہ محسوس نہیں کیا جاتا، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بہت حد تک اس جنریشن میں سرایت کرگئی ہے کہ اپنی بات منوانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپ کے پاس دلائل ہوں، بلکہ صرف یہ ضروری ہے کہ آپ کے ہاتھ میں ہتھیار ہوں۔

انور سن رائے: اس لیے کہ انہیں یہ یقین ہوگیا ہے کہ صرف اسی طریقے سے اپنی بات منوائی جاسکتی ہے۔

آصف فرخی: کہیں ایسا تو نہیں کہ باقی طریقوں کی ناکامی کا احساس پیدا ہوگیا ہے۔ لوگوں نے انہیں ناکام ہوتے ہوئے دیکھا ہے، یا کم از کم محسوس کیا ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: نہیں، دیکھا ہے۔ یہی دیکھا ہے کہ باقی چیزیں ......

انور سن رائے: ناکام ہوچکی ہیں، یہ کہنا تو بہت زیادتی ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: ہاں ...... دیکھا ہے، سنا ہے، محسوس کیا ہے۔ ہمارے آپ کے مشاہدے میں ہے۔ ہم اس کا مختلف طریقے سے تجزیہ کرتے ہیں۔ لیکن جو بچے اس دور میں بڑے ہوئے ہیں ان کو یقین ہے کہ بس یہی ایک طریقہ ہے جو باقی رہ گیا ہے۔ تو میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ریاستی تشدّد تو ہمیشہ رہا ہے، ترقّی پذیر ملکوں میں کافی رہا ہے، اب بھی ہے۔ اور ہمیں اندازہ ہے کہ اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جو ریاست سے ہٹ کر تشدّد ہم دیکھ رہے ہیں، جسے گروہی تشدّد بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک دوسرے گروہ کو زیر کرنے کے لیے تشدّد کر رہا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں سلسلہ اس طرح نہیں رہا ہے کہ ہم کتنے ووٹ لے کر آتے ہیں یا جمہوری طریقے سے اپنی بات منواتے ہیں بلکہ اس پر انحصار رہا ہے کہ کس گروہ کے پاس کتنی بندوقیں ہیں اور وہ ان کا

کتنا اچھا استعمال کرتا ہے۔ تو یہ طریقہ کار رائج رہا ہے۔ اس طرح تشدد اور ایذا رسانی، ریاستی تشدد سے ہٹ کر بھی عام گروہی تشدد میں ظاہر ہوگئی۔

آصف فرخی: اس ساری صورت حال میں یہ نئی بات ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: یہ نئی بات ہوئی۔ اور یہ نئی بات اس طرح ہوئی کہ جس پیمانے پر ہمارے ملک میں یہ ہو رہا ہے، تو میرے خیال میں اس نوعیت کا اور اس شدت کا تشدد رکارڈ نہیں ہوا ہے کہ شروع میں تو بہت تکلیف ہوتی تھی سن کر، یہ ڈرل کرنا اور جس طرح کی باتیں سامنے آتی رہی ہیں، پھر یہ جیسے تم نے کہا کہ روز کی بات ہوگئی۔ تمہارا سوال یہ تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ ڈرل کرنا اور جس طرح کی باتیں سامنے آتی رہی ہیں، پھر یہ جیسے تم نے کہا کہ روز کی بات ہوگئی۔ تمہارا سوال یہ تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ تو یہ ہوگئی ہے کہ انہوں نے یہ سیکھا ہے۔ انہوں نے یہی سیکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ تشدد کرتے ہیں اور ایذا رسانی کرتے ہیں، ان کی بھی ایک خاص نفسیات ہوتی ہے۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ کیسے ایک شخص دوسرے کو اتنی تکلیف پہنچا کر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے اور بات منواتا ہی نہیں، یہاں تک اذیت پہنچاتا ہے کہ اس کو مار ہی ڈالے۔ آپ اگر غور کریں کہ جب ہندوستان تقسیم ہوا تھا تو اس وقت جو کیفیات تھیں، چند سال میں جو جذبات ابھارے گئے یا ابھرے، اس کی بناء پر کیا کچھ ہوا۔ بنگلہ دیش بنا تو اس وقت جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے، اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ وہ لوگ جو پرانے ساتھی تھے، دوست تھے، ایک خاص ذہنی کیفیت پیدا ہوئی تو انہوں نے ایک دوسرے کو کس بے دردی سے مارا اور تشدد کیا۔ اسی طرح یہ بہت تعجب کی بات ہے کہ کچھ لوگ جو ایک ہی گروہ میں ہیں، ایک ہی طرح کی سیاست کر رہے ہیں، ان میں تھوڑا بہت اختلاف رائے ہوجائے تو وہ اپنی بات کو منوانے کے لیے اسی شدومد کے ساتھ تشدد کرتے ہیں۔ تو اس کی سائیکی اور طرح کی ہے کہ بعض شخصیات ...... ہمارے ہاں سیاست میں ایک خاص انداز سے داخل ہوتے ہیں یہ لوگ۔ آپ یہ دیکھیے کہ ہمارے ہاں بہت سے

لوگ ایسے ہیں جو کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں حالاں کہ انہیں پارٹی کی سیاست سے بس ضمنی دلچسپی ہے۔ وہ اس لیے کہ ہمارے ہاں پاور حاصل کرنا ہی ضروری سمجھا جاتا ہے، اور پارٹی کا جو بھی منشور ہے، تو ضروری نہیں کہ بعد میں اس پر عمل بھی کیا جائے۔ یہ سوچ لے کر لوگ سیاسی پارٹی میں آتے ہیں۔ ہم اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ضروری ہے، یہ ہونا چاہیے، اور ہم اس کی تائید بھی کریں گے۔ لیکن اگر حکومت جمہوری طریقے پر منتخب ہو کر بھی آتی ہے تو وہ ایفائے عہد والی بات بہت جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بہت سے لوگ اس طرح Marginailze ہوتے ہیں، وہ لوگ جو فعال کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سیاست میں آنا ہمارے ہاں اس طرح بن گیا ہے کہ سیاست ایک کاروبار ہے۔ سیاست میں پیسہ لگائیں، سیاست سے پیسہ حاصل کریں۔ تو پھر اصولوں کی ساری باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کا ایک اور بھی پہلو اگر آپ لیں اور غور کریں۔ پچھلے آٹھ دس سال میں طلباء کی سیاست ختم ہو گئی تھی اداروں میں، چوں کہ انتخابات ختم کر دیے گئے تھے، یونین ختم کر دی گئی تھی جو جمہوری طریقوں سے کام کرتی تھیں۔ گروہی اور لسانی تنظیمیں جاری رکھی گئیں۔ تو ان سے تشدّد کا یہ سلسلہ شروع ہوا۔

انور سن رائے: ان سے تشدّد کی نمو ہوئی۔

ڈاکٹر ہارون احمد: بالکل، ان سے تشدّد کی نمو ہوئی اور اس طرح یہ سب ہوا۔ سیاست میں ایک اور بھی بات ہے۔ اس قسم کی سیاست میں ایسے افراد زیادہ شامل ہوتے ہیں جن کی ایک خاص شخصیت ہوتی ہے جسے ہم Border Line Personality کہتے ہیں، جو کہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے دھارے سے کٹ جاتے ہیں۔ اور دھارے سے کٹ جاتے ہیں تو پھر منشیات کا استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں یا چوری ڈکیتی کرتے ہیں، یا وہ جسے ہم Politics Of Nihilsm کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ اپنا Anxiety Management اس طرح کرتے ہیں۔ تو میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ Withdraw کر جائیں، تو یہ وہ چند لوگ جن میں اپنی شخصیت کی ساخت

کی بناء پر وہ حساسیت نہیں ہوتی ہے اور انہیں Psychopath کہا جا سکتا ہے۔ ان میں Inter-Personal Relations بہت Cool ہوتے ہیں۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے یہ سب سیکھا ہے اور ان کی پرسنلیٹی جس طرح ڈیولپ ہوئی ہے، وہ ایسے لوگ ہیں جو نفسیاتی نقطہ نگاہ سے یہ سب کرسکتے ہیں اور ہمیں ...... کم از کم مجھے تو تعجب نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کرتے ہیں۔

آصف فرّخی : یہ تو ایک طرح کا مائنڈ سیٹ ہوا۔ ایک خاص قسم کا لیڈر سامنے آیا جس نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کو کسی نہ کسی حد تک استعمال کیا اور اس کی ہمارے ہاں باقاعدہ ایک تاریخ رہی ہے۔ کسی بات کے تاریخی ہوجانے سے اس کا ڈسٹربنگ ہوجانا کم نہیں ہوتا۔ پھر بھی جو بات مجھے زیادہ عجیب لگ رہی ہے، وہ یہ کہ اس تشدد کے صارفین بھی بن گئے ہیں۔ Consumers Of Violence۔ یہ سب نام نہاد نارمل افراد ہیں جو اخبار میں یہ پڑھ کر واپس اپنی نارمل زندگی میں یوں چلے جاتے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جنہیں یہ خوب اندازہ ہوگیا ہے کہ معاشرے میں تشدّد نے ٹارچر کی شکل اختیار کرلی ہے، اس کے باوجود وہ اس سے الگ تھلگ اور بظاہر غیر متعلق زندگیاں گزار رہے ہیں تو مجھے ان لوگوں کی نفسیات سے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ بھی سائیکو پیتھی کی کوئی اجتماعی شکل تو نہیں۔

ڈاکٹر ہارون احمد : اثر تو سب پر ضرور پڑتا ہے۔ یہ کہنا ممکن نہیں کہ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن ان کا کوئی منظم طریقہ نہیں ہے اس احساس کو ظاہر کرنے کے لیے۔ ایک تو یہ بات ہوئی۔ دوسرے یہ کہ ہمیں ابھی نہیں معلوم کہ آج کل کی نئی پود آگے کیا رنگ لائے گی۔ میں نے ابھی بتایا کہ پچھلے دس سال میں جو بڑے ہوئے ہیں، ان پر حالات کا کیا ممکنہ اثر رہا ہوگا۔ آج کل جو بے یقینی کی کیفیات ہیں، تو یہ سب دیکھ رہے ہیں۔ ہم گھر سے نکل رہے ہیں تو ذہن میں سوال ہے کہ کیا ہماری جان محفوظ ہے، گاڑی محفوظ ہے یا واپس جائیں گے تو گھر محفوظ ہوگا۔ یہ سب کہ ذہن میں ہوتا ہے، کیوں کہ یہ نہیں کہ لوگ اس

سے الگ ہیں۔ چوں کہ ان کو اس کے اظہار کرنے کا کوئی طریقہ میسّر نہیں ہے، پلیٹ فارم نہیں ہے، کوئی جگہ نہیں ہے، اس لیے وہ محسوس تو کرتے ہیں، یہ کہنا درست نہیں کہ محسوس نہیں کرتے، لیکن اس کو ظاہر نہیں کر پاتے۔ آپ نے پہلے بھی یہ سنا ہوگا، یا اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ ویت نام میں اتنے لوگ مرگئے یا بوسنیا میں اتنے لوگ مرگئے۔ ایک دن پڑھا، دو دن پڑھا، تین دن پڑھا، ایک ہفتہ، ایک مہینہ ...... پھر یہ خبر De - Sensitize کر دیتی ہے انسان کو۔ اس کا اثر یوں سمجھئے کہ کند ہو جاتا ہے۔ پھر یہ ایک طرح کا Defence Mechanism ہے۔ کچھ دن پہلے اخبار میں خبر آئی کہ ڈرگ روڈ میں فلاں جگہ چار، چھ مہینے کرفیو لگا رہا۔ ہمارے دفتر کا ایک کارکن وہاں رہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارے ہاں تو کافی ہنگامہ ہے، تم ایسا کرو کہ دیکھ لو اور آرام سے آیا کرو، مشکل ہو تو نہ آیا کرو، کچھ دن چھٹی کرلو۔ وہ کہنے لگا، ہمارے ہاں کچھ نہیں ہے، میں نے پوچھا، پھر کہاں ہے۔ کہنے لگا کہ تین لائن چھوڑ کر ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ علاقے میں ہے بلکہ تین لائن چھوڑ کر ہے۔ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں گولیاں وولیاں بہت چل رہی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس نے اپنے آپ کو Cut Off کرلیا ہے، اس لیے کہ وہ اپنا Anxiety Management اس طرح کرتا ہے کہ یہاں نہیں ہے، وہاں ہے، تین لائن آگے۔ کلفٹن ڈیفنس کے علاقوں میں جو لوگ رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ سب وہاں ہے، شہر کے ان علاقوں میں ہے، یہاں نہیں ہے۔

آصف فرّخی: یعنی ایک رویہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ شہر کا مسئلہ نہیں ہے، ہمارا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ چند محلّوں کی بات ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: ہاں، کہ یہ ان محلّوں کی بات ہے۔ یعنی جس طرح ہسٹیریا میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ ہسٹیریائی صورت حال ہے۔ اور اس میں ایک حقیقت اور دوسری حقیقت کو بالکل ہی الگ کر دیتے ہیں، اور اپنے آپ کو تحفظ دینے کی ایک فطری جبلت ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے پھر وہ چلتے پھرتے رہتے ہیں اور کام کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ خوف کو اپنالیں تو ان کی ہیجانی موت واقع

ہوجائے۔ تو میں تو یہ کہوں گا کہ یہ Anxiety Management کا طریقہ ہے کہ آدمی اس صورت حال کو الگ کر دیتا ہے کہ اس کا مجھ سے تعلق نہیں۔ عام زندگی میں بھی بعض لوگوں میں یہ رویہ نظر آتا ہے، جب وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب، یہ بیماری مجھے نہیں ہوسکتی۔ بعض لوگ، جو پریشان ہوجاتے ہیں ان کو نیوروٹک کہتے ہیں، وہ یہ سوچتے ہیں کہ مجھے کینسر نہ ہوجائے، فلاں کو ہوا ہے۔ مجھے ہارٹ اٹیک نہ ہوجائے، میرے باپ کو ہوا ہے۔ تو وہ یہ سوچ سوچ کر مفلوج ہوجاتے ہیں، کوئی کام وام نہیں کرپاتے۔ تو اس طرح مجموعی طور پر سوشل سچویشن میں وہ اس سب کو الگ کرتے ہیں تاکہ خود فعال رہیں۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ ہونا تو یوں چاہیے، لیکن جب یہ کیفیت ہوتی ہے تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ دباؤ کی وجہ سے لوگ Regress کرجاتے ہیں۔ آپ کا ایک خیال ہے کہ یوں ہونا چاہیے، لیکن جب یہ کیفیت ہوتی تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ Regress کرکے وہ لوگ پھر اپنے گروہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں، وہ گروہ لسانی نوعیت کا ہو یا علاقائی نوعیت کا ہو......

انور سن رائے: عقائد کے حساب سے ہو یا قومیت کی بنیاد پر ہو......

ڈاکٹر ہارون احمد: ہاں...... تو وہ لوگ جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ انصاف ہونا چاہیے، ترقی ہونا چاہیے وہ بھی ان حالات میں تحفظ محسوس کرنے لگتے ہیں Regress کرکے سمٹنے میں......

آصف فرخی: علاقائی یا لسانی شناخت انہیں پناہ گاہ نظر آتی ہے چاہے اس میں سمٹنے کی خاطر آدرشوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یعنی "واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں۔"

ڈاکٹر ہارون احمد: تو جب وہ پناہ گاہ بن گئی تو پھر وہاں سے تصادم شروع۔ چاہے ہم ایسا نہیں چاہتے ہوں، لیکن یہ پھر نئے حوالے سے متصادم ہوجاتی ہے۔

انور سن رائے: جن لوگوں کو تشدد کرنے کے لیے ہمارے ریاستی اداروں میں استعمال کیا جاتا ہے، ان کی سماجی زندگیاں بھی خاصی منتشر ہوتی

ہیں۔ وہ اس تشدد کے اثرات کو کیسے overcome کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی اندوہناک بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس نفسیاتی کیفیت کو نفسیاتی بیماری ہی نہیں تسلیم کرتے۔ایسی ایک واردات کے بعد اس کا نظام ہضم متاثر ہوجاتا ہے' اس کو نیند کم آتی ہے' اس کی فیملی لائف متاثر ہوتی ہے' میاں بیوی کے تعلقات متغیر ہوجاتے ہیں' ان سب چیزوں کا ہم نوٹس نہیں لیتے۔

ڈاکٹر ہارون احمد : ہاں' لیکن یہ کہ ایسے شخص کے اوپر اثرات کی نوعیت بھی ذرا مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً پولیس فورس ہے اس میں کون لوگ کس طرح لیے جاتے ہیں۔ان کا چناؤ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ کون زیادہ تشدد کرسکتا ہے' زیادہ اثر لیے بغیر۔ اس کی مثال ان بچوّں سے دی جاسکتی ہے جن میں Minimal Brain Damage کی کیفیت ہے۔ان میں بعض بچّے ایسے ہیں جن میں تشدد کرنے کا رجحان زیادہ ہے۔ مثلاً انھوں نے مرغی لی اور اس کی گردن توڑ مروڑ دی۔کہیں اس کو ماچس مل گئی تو اس نے آگ لگادی۔اب بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو تشدد کرکے ذاتی تسلّی محسوس ہوتی ہے۔بچپن میں بھی ان میں یہ کیفیت ہوتی ہے اور جب بڑے ہوتے ہیں تو ایسے لوگ جو تشدّد کرتے ہیں' ایسی کسی جگہ جمع ہوجاتے ہیں اور اپنی فیملی سے ان کا رابطہ محدود ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ پولیس میں ہیں' وہ چوبیس گھنٹے اسی سلسلے میں رہتے ہیں' ان کی ڈیوٹی اس طرح کی ہوتی ہے ......

انور سن رائے : وہ سب سے کم گھر پر رہتے ہیں۔کوشش کرتے ہیں کہ گھر میں کم سے کم رہیں' گھر جاکر سوجاتے ہیں پھر نہادھوکر اسی ڈیوٹی پر۔

ڈاکٹر ہارون احمد : اس لیے کہ وہ نارمل زندگی میں شریک نہیں ہوسکتے۔ ورنہ ان پر ان سب باتوں کا اثر ہوگا۔ان کے بہن بھائی ہیں' رشتے دار ہیں' بیوی بچّے ہیں تو ان کا بھی کچھ نہ کچھ اثر تو ہوگا۔ وہ ان سب کا بہت کم اثر لے کر تشدّد کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھتا ہے۔

آصف فرخی : یہ تو آپ اس شخص کا ذکر کررہے ہیں جو کسی نفسیاتی عارضے کا شکار ہے یا جس نے تشدّد کرنے کی باقاعدہ پیشہ ورانہ تربیت لی ہوئی

ہے لیکن ہمارے ہاں تشدد کی جو صورتیں اب رواج پارہی ہیں' اس میں یہ تشدد کرنے والا اور دوسروں کو اذیت دینے والا بظاہر نفسیاتی مریض نہیں ہے اور نارمل انسان سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ آپ کسی پر تکلف دعوت میں ہیں اور جو شخص آپ کے ساتھ عشائیے میں شریک ہے اور اعلا لباس پہنے ہوئے ہے اور جس سے یوں تعارف کرایا جاتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار اور حساس عہدے پر فائز ہے۔ اور اس کی سماجی گفتگو سے کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اسی کے حکم سے لوگوں پر گولیاں برسائی گئی اور قیدیوں کو اذیت دی گئی۔ یا پھر وہ شخص جو خدا کے قہر و غضب سے ڈرتا ہے' زبان سے کلمہ ادا کرتا ہے' پانچ وقت نماز پڑھتا ہے' اپنے آپ کو مومن کے درجے پر فائز دیکھنے کی تمنا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو جو کسی اور طریقے سے نماز کی نیت باندھتے ہیں' واجب القتل سمجھتا ہے۔ نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ ان کی مسجد پر فائرنگ کرکے وہاں سے چلا بھی جاتا ہے۔ جس شخص کو Minimal Brain Damage ہے' اس کے مقابلے میں یہ دوسرا شخص زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے بلکہ دہشت زدہ کرکے چھوڑتا ہے۔ پاگل کا مسئلہ تو کچھ اور ہے اور آپ کے شاگرد کی حیثیت سے میں اندازہ لگاسکتا ہوں کہ اس مسئلے سے نبرد آزما ہونے کا طریقہ کیا ہے۔ لیکن یہ جو دوسرا آدمی ہے' جو پاگل نہیں ہے' جو باقی تمام شواہد کی روشنی میں نارمل ہے تو مجھے یہ سوچ کر ڈر لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ نارمل آدمی کس قدر تشدد اور اذیت رسانی پر اتر سکتا ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: تشدد کرنے والوں کی بھی نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔

آصف فرخی: اذیت رسانی کے اس سارے عمل میں تین لوگ بار بار ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ پہلا شخص جو اس کا شکار ہے۔ اس کے بارے میں ہم کسی قدر جانتے ہیں کہ اس پر جسمانی یا نفسیاتی اثرات کیا مرتب ہوں گے۔ خود ہمارے معاشرے میں بھی اس قسم کی دستاویزات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں پر کیا گزری۔ لیکن دوسرا شخص جو اس سب کا ذمہ دار ہے' اس کی نفسیات کے بارے میں بھی آپ نے اشارہ کیا۔ مجھے پھر بھی یہ شخص غیر حقیقی

سالگتا ہے۔ ادھر میں کہانیوں کے جس سلسلے پر کام کر رہا ہوں، تو ان کہانیوں میں کسی ایسے کردار کو پیش کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہو سکا جو اذیت پہنچاتا رہا ہو۔ اس لیے کہ میں اس کردار کی کھال کے اندر گھس نہیں سکتا۔ بہرحال آپ نے بتایا ہے کہ وہ کون ہے اور کیا سوچتا ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ حیران مجھے وہ تیسرا آدمی کرتا ہے جو اذیت رسانی کی خبر اخبار میں پڑھتا ہے اور اس کو پڑھ کر اپنے اسی طریقے سے زندگی کرتا رہتا ہے۔ کیا یہ محض اخباری آدمی ہے اور اس کے رویے کا ذمہ دار اخبارات ہیں۔ اس ترجمے کے دوران میں یہ سوچتا رہا اور ڈرتا رہا کہ اس معاشرے میں ایسی مزید مثالوں کی تشہیر کی اور کیا ضرورت ہے، اور کہیں اس کتاب سے اذیت دینے والوں کو چند اور نئے طریقے نہ معلوم ہو جائیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے سنسنی محسوس کریں، پھر کتابوں کے ڈھیر میں واپس رکھ دیں۔

انور سن رائے: ڈاکٹر صاحب، تشہیر کا یہ معاملہ میرے لیے مشکل پیدا کرتا رہا ہے۔ کیوں کہ میں ایک اخبار سے وابستہ ہوں۔ اور ذاتی طور پر بھی اس بارے میں کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اگر اس سب کو شائع کرتے ہیں تو اس سے ان لوگوں کے متاثر ہونے کا بھی احتمال رہتا ہے جو براہ راست اس صورت حال کا نشانہ نہیں بنے لیکن اس کی تفصیلات کی اشاعت کے نتیجے میں، اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے گزرے بغیر اس صورت حال میں داخل ہونے کا ان کے لیے ایک راستہ بن جاتا ہے۔ اور اگر شائع نہ کریں تو تشدّد کرنے والوں کو ایک موقع اور مل جاتا ہے اور لوگوں کے سامنے ان کی باتیں نہیں آتیں اور ان کے خلاف مدافعت نہیں کی جا سکتی۔ تو یہ دونوں باتیں ہیں۔ ایک خاتون کا کیس سامنے آیا جو اس وقت حکومت کی مشیر ہیں، لیکن پچھلے دور حکومت میں نشانہ بنی تھیں تو میرا رپورٹر ان کا انٹرویو کر کے لایا۔ میں نے اس کو اسی طرح چھاپ دیا جس طرح وہ تھا۔ جیسا منتشر وہ تھا بالکل اسی اسی طرح۔ پھر اس پر ایک رائٹ اپ بھی تیار کیا کہ یہ گفتگو بتاتی ہے کہ کتنا زیادہ تشدد کیا گیا اور اس کے لیے کوئی اور گواہ نہ بھی دستیاب ہو تو اس گفتگو کی شہادت کافی ہے اور اس گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے کیس میں تشدّد ضرور

واقع ہوا ہے۔ اور اس کا نشانہ یہ فرد بنا ہے' کیوں کہ گفتگو میں جو Pauses اور Stresses ہیں' جو وقفے ہیں اور سسکیاں ہیں ...... اور اس کا کیسٹ بھی میں نے سنا...... تو یہ اداکاری سے ممکن نہیں۔ لیکن اس گفتگو کی اشاعت بات کو Convey نہیں کر سکی۔ لوگوں کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اصل میں واقعہ کیا رونما ہوا ہے۔ تو اس کیس میں یہ مسئلہ نہیں اٹھا۔ لیکن جب ہم ایک تصویر شائع کرتے ہیں' تو اس پر آج کل کی انتظامیہ بھی بہت زیادہ احتجاج کرتی ہے' ناراضگی کا اظہار کرتی ہے اس سے لوگوں میں خوف پیدا ہوتا ہے' اس سے مجھے اختلاف نہیں۔ لیکن اس کو اگر شائع نہ کریں تو ایک طرح سے ان لوگوں کی سرپرستی ہوتی ہے' ان کو میڈیا کی خاموشی سے Support مل جاتی ہے اور ان کو زیادہ Free Hand مل جاتا ہے یہ سب حرکتیں کرنے کے لیے۔ تو یہ ایک مسئلہ ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: اس کے دو پہلو ہیں' جس طرح آپ نے فرمایا' اور وہ یہ کہ اس سے پہلے ریاستی تشدد عام طور سنسر ہوجایا کرتے تھے اور لوگوں کو نہیں معلوم ہوا کرتے تھے' اور اس وقت یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جن پر تشدد کیا گیا ان کی شخصیت پر اس کا کیا اثر پڑا بعد میں' جس پر اب کچھ تحقیقی کام ہوا ہے۔ لیکن جب کہ تشدد اس نوعیت کا ہو جس کو چھپایا نہ جاسکے کہ پانچ آدمی مرے اور دس آدمی مرے اور کس طرح مرے۔ اب اس کی مثال آپ نے دی کہ ایک انٹرویو چھاپا اور پھر تصویر کا مسئلہ ہوا۔ تو اس طرح کی چیزوں کے جو اثرات ہوتے ہیں' اس کی دلیل ایک تو یہ ہے کہ عام لوگ De-Sensitize ہوجاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک دفعہ دیکھا' دو دفعہ دیکھا' تیسری دفعہ اس کی معنویت ختم ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ اس سے خوف پیدا ہوتا ہے اور جو لوگ ظلم کے خلاف کچھ کرنا چاہتے ہیں' وہ بھی ڈر کے مارے کچھ نہیں کرتے۔ لیکن اگر آپ غور کریں کہ یہ تو آج کی بات ہے۔ لیکن ایسے ممالک ہیں جہاں یہ چیزیں بہت پہلے ہوا کرتی رہی ہیں۔ انگلستان میں پرانے بادشاہوں کے زمانے میں تھوڑی بہت تشدد کی داستانیں تو ہیں۔ کس حد تک یہ ہوتا تھا' یہ تو ہمیں پوری طرح نہیں معلوم۔ لیکن ذرائع ابلاغ اور انسانی حقوق کے حوالے

سے یہ مسئلہ بڑے پیمانے پر اٹھا ہے۔ ابھی تو اس کے اثرات معلوم نہیں ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان چیزوں کا لوگوں کو بتانا بہت ضروری ہے۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں ابھی نہیں تو کچھ عرصے کے بعد، جو لوگ یہ سب کر رہے ہیں ان کا امیج عام لوگوں کی نظروں میں کم ہوجائے گا۔ اور وہ Isolate ہوجائیں گے۔ جس طرح کسی حکومت کے بارے میں رپورٹ چھپتی ہے کہ وہاں انسانی حقوق کے حوالے سے یہ ہوا تو وہ حکومت Defensive پر آجاتی ہے۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کا Display اور انفارمیشن بہت ضروری ہے، اگر بہت سے لوگ اس سے ڈر جائیں گے تو بہت سے لوگ اس کے خلاف متحرک بھی ہوسکتے ہیں۔

انور سن رائے: میرے ذاتی تجربے کی بات ہے ایک ورکنگ جرنلسٹ کی حیثیت سے کہ پہلے ہم صرف خبریں شائع کرتے تھے اور تصویریں عام طور پر بنتی نہیں تھیں۔ تصویریں بنانے سے گریز بھی کیا جاتا تھا اور اس میں خطرہ بھی تھا۔ ان دونوں باتوں کے نتیجے میں تصویر کی اشاعت نہیں ہوتی تھی اور صرف لفظوں میں وہ صورت حال بیان کی جاتی تھی، تو بالعموم جس صورت حال کا سامنا مجھے کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ ہماری شہرت یہ ہوگئی کہ یہ اخبار حقائق کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور حقائق اصل میں ایسے نہیں ہیں۔ اس میں ریاستی مشینری کو بھی یہ پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جب کہ ہم پوری سنجیدگی سے یہ کر رہے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ حقائق اس سے زیادہ خراب ہیں اور جتنا ہم بیان کر رہے ہیں وہ کم ہے اور ہمیشہ کم ہی بیان کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ پوری صورت حال اپنے پورے حوالوں کے ساتھ اور پوری شہادتوں کے ساتھ سامنے نہیں آتی۔ جو تھوڑی بہت ظاہری شہادتیں ملتی ہیں ان کو بنیاد بنا کر خبر شائع کی جاتی ہے۔ لیکن تصویریں شامل کرنے کے بعد مجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی، کیوں کہ ہمارے اخبار میں یہ سب سے زیادہ شائع ہوئی ہیں، اور میں جن دو تین اخباروں کو ایڈٹ کرتا رہا ہوں ان میں، میں نے بالخصوص اس بات کی کوشش کی کہ جس بات کے بارے میں اتنا شک وشبہ ہے اور وہ انہونی سی بھی محسوس ہوتی ہے ہماری پوری معاشری ساخت میں، تو اور

ہم اس میں تصویر کو بھی شامل کرتے ہیں تو پھر اس خبر کی ساکھ یا Credibility مشکوک نہیں رہے گی۔اس میں ایڈمنسٹریشن کو Play کرنے کا یا Divert کرنے کا اتنا موقع نہیں ملے گا۔اس کے بعد سے ہم نے تصویروں کو شائع کرنا شروع کیا۔اس کے بعد انتظامیہ نے ایک نیا موقف اختیار کیا کہ جی' جب آپ یہ شائع کرتے ہیں تو یہ ایک طرح سے ملک دشمنی ہے ......

ڈاکٹر ہارون احمد: اچھا یہ بات بھی کہی جاتی ہے۔

انور سن رائے: یعنی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو ہم ہائی لائٹ کرتے ہیں تو ایک طرح سے ملک دشمنی ہے کیوں کہ ملک کی مجموعی ساکھ پر اثر پڑتا ہے اور مختلف عالمی معاملات پر ہمارا جو موقف ہے تو ہمیں اس میں وہ Edge حاصل نہیں رہتا۔مثلاً اگر ہم کشمیر کی بات کرتے ہیں' بوسنیا کی بات کرتے ہیں یا دنیا میں جہاں جہاں ان حقوق کی خلاف ورزی ہورہی ہے ان کی بات کرتے ہیں اور اگر ہمارے ہاں بھی ویسی صورت حال ہے اور ہم اپنے اخبار میں اس کو بیان کرتے ہیں تو اس بیان کے نتیجے میں ہمارا موقف قومی سطح پر کم زور ہوجاتا ہے۔اور عالمی سطح پر بھی ہم پیچھے رہ جاتے ہیں۔تو ایک طرح کا دباؤ تھا جس کا میں شکار رہا ہوں کہ اگر اپنے ہاں کی صورت حال کو بیان نہ کریں تو ایک طرح سے ظلم میں شریک ہوجاتے ہیں' جس طرح آپ نے کہا۔اور اگر بیان کرتے ہیں تو Guilt کا ایک احساس ہماری طرف Divert کیا جاتا ہے کہ آپ تو خود ملک دشمن ہیں' ایک ایسا طرز عمل آپ نے اختیار کیا ہے جو ملک دشمنی کے زمرے میں شامل ہوتا ہے۔تو یہ ایک مسئلہ رہا ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: آپ نے غور کیا ہوگا کہ جب سے پاکستان بنا ہے' اس کے بعد سے بھی جو حکومت آئی ہے' اس نے پچھلی حکومت کو ملک دشمن کہا ہے اور ساری پالیسیاں الٹ دی ہیں۔اس سے ایک تو یہ ہوا ہے کہ کوئی رول ماڈل ہمارے ہاں بنا ہی نہیں ہے اور ایک کے بعد دوسرے جو آئے ہیں تو عام لوگوں میں کسی بھی لیڈر پر اعتماد ختم ہوگیا ہے۔اور یہ جو آپ نے کہا کہ ملک دشمن والی بات' تو چوں کہ ہمارے ہاں جو حاکم ہے' جو اس وقت حکومت کر رہا

ہے' اس نے حکومت اور ملک کو یک جا کر دیا ہے۔ یعنی آپ حب الوطنی کا سرٹیفکٹ ہم سے لیں۔ آپ اگر وہ نہیں کر رہے جو ہم سوچتے ہیں ......

آصف فرّخی : اس وقت کی حکومت سے وفاداری کو اصل حب الوطنی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد : جی ہاں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری وفاداری اصل حب الوطنی ہے۔ تو یہ سوچ ہمارے ہاں حاوی رہی ہے۔ تو یہ ہوتا رہا ہے لیکن اس میں' میرا خیال ہے' تبدیلی آنی چاہیے' بجائے اس کے کہ اخبارات اس کی ترویج کریں۔ تو آپ لوگ یہ ذمہ داری برتیئے کہ اس کو کسی نہ کسی حد تک Resist کریں۔ دوسری بات سنسنی خیزی کا جو الزام آپ لوگوں پر ہے کہ شام کا اخبار پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں رہنا بڑا مشکل ہے اور صبح کا اخبار ایسا نہیں لگتا۔ وہ اس طرح کہ دس آدمی مارے گئے تو دو کی ایک جگہ خبر دی' دو کی ایک جگہ خبر دی' کچھ اس طرح کر کے ......

انور سن رائے : یہ Space - Distorted انفارمیشن ہوتی ہے ان اخباروں میں۔ جب کہ Cumulative ہوتی ہے شام کے اخباروں میں۔

ڈاکٹر ہارون احمد : لیکن مجھے جو تھوڑا سا اعتراض ہے' وہ یہ کہ میں ایک قاری کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ اگر آج میں نے ایک خبر پڑھی اور ایک تصویر دیکھی تو کچھ جستجو ہوتی ہے کہ کیا ہوا اس کا۔ فالو اپ نہیں ہوتا ہے ان اخباروں میں۔ تو چوں کہ فالو اپ نہیں ہوتا ہے اس لیے ہم اس سے کٹ جاتے ہیں اور اگلے روز دوسری تصویر آجاتی ہے' تیسرے روز تیسری' پھر چوتھی' پھر پانچویں ...... تو وہ ہمارے لیے ایک نمبر بن جاتی ہے۔ ایک زمانے میں آج سے کوئی دس سال پہلے اگر کوئی قتل کا کیس ہوتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ پولیس اس میں کوئی لڑکی شامل کر دیتی ہے تاکہ خبریں اگلے روز بھی اور اس کے بعد بھی آتی رہیں۔ اب جو میں نے خاص طریقے سے دیکھا ہے تو وہ یہ کہ فالو اپ نہیں ہوتا اور فالو اپ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ذہن میں تسلسل جو اس کیس کے تعلق سے بن سکتا تھا' وہ ختم ہو جاتا ہے اور ہم دوسرے دن کے

اخبار میں دوسری خبر پڑھ لیتے ہیں۔اس طرح اس کی جو In Depth بات ہے وہ نہیں ہوتی اور جو ہم محسوس کرتے ہیں وہ ختم ہوجاتا ہے اور اس کے بعد Head Count رہ جاتا ہے کہ آج کتنے مرگئے۔

انور سن رائے : ڈاکٹر صاحب، سنسنی خیزی کا معاملہ یہ ہے کہ جہاں ہم اس سنسنی خیزی کو اپنے طور پر Define کرتے ہیں کہ کسی واقعے کو اس کی اصل حدود سے بڑھ کر بیان کیا جائے۔اور اس طرح سے بیان کیا جائے کہ وہ لوگوں کو...... اب دو لفظ ہیں اس کے لیے۔ایک طرف "مشتعل" رکھ دیں۔ اور ایک طرف "متحرک" رکھ دیں۔ تو مشتعل یا متحرک کرے۔اگر ہم تحریک نہیں دیتے تو وہ واقعہ رکتا نہیں۔انتظامیہ اس کے لیے لفظ استعمال کرتی ہے کہ وہ اشتعال پیدا کرتا ہے۔اشتعال اور تحریک ایک ہی ردعمل کے دو نام ہیں۔

آصف فرخی : اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ معلومات لوگوں کا حق ہے۔ شہر میں جو کچھ ہورہا ہے، ٹارچر ہورہا ہے، لاشیں مل رہی ہیں، تو اس کے بارے میں صحیح معلومات کے لیے لوگ آخر کس طرف جائیں۔

انور سن رائے : نہیں، میں اس طرف بھی آتا ہوں۔اب ہمارے ہاں صورت حال یہ ہے ...... مجھے اس کا افسوس رہتا ہے کہ جو بھی صورت حال رو نما ہوتی ہے، ہم اس کو پوری طرح سے بیان نہیں کرپاتے۔کراچی میں خاص طور پر۔کراچی کے حوالے سے بات کررہا ہوں۔یہ شہر اتنا بڑا ہے اور ہمارے پاس اخبارات میں جو وسائل ہیں، وہ اتنے زیادہ نہیں ہوتے کہ ہم اتنی افرادی قوت کو اس پر متعین کرسکیں جو پورے حقائق کو Dig out کرکے سامنے لاسکے۔ لہٰذا جتنی بھی اطلاعات حاصل ہوتی ہیں اور اس کی جس حد تک تفصیلات جمع کی جاسکتی ہیں، اس کو جمع کرکے شائع کردیا جاتا ہے۔ فالو اپ یوں نہیں ہوپاتا کہ اتنی تیزی سے رونما ہونے لگے ہیں اب واقعات کہ ایک واقعے کو ہم پوری طرح چھاپ بھی نہیں پاتے کہ دوسرا رونما ہوجاتا ہے، پھر تیسرا ہوجاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی تفصیل سمٹتی جاتی ہے۔اگر ہم صرف انہی کو شائع کریں تو ایک اخبار سارے کا سارا روزانہ صرف انہی واقعات پر مبنی شائع

ہوسکتا ہے۔ اتنی زیادہ تعداد میں اور اس قدر Variations کے ساتھ یہ واقعات رونما ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے آج سے دو ڈھائی سال پہلے ایک شخص کو لیاری پولیس اسٹیشن میں پولیس تشدد کے ذریعے ہلاک کردیا گیا۔ اس کا نام تھا نذیر۔ ہم نے اس کی پہلے دن خبر چھاپی۔ دوسرے دن تین رپورٹر لگائے۔ تیسرے دن ان تین رپورٹرز نے کام کیا' پھر چوتھے دن بھی ...... چار دن تک ہم نے اس کے پورے حقائق اور تفصیلات یہاں تک کہ اس کی گرفتاری کا وقت' اس کے تھانے لے جائے جانے کا وقت' اس وقت کن لوگوں نے اس کو دیکھا' یہ ساری شہادتیں جمع کرکے ہم نے پورا تقریباً کیس چھاپ دیا۔ یہ اس لیے ممکن ہوسکا کہ اس طرح کا اور کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ اس صورت میں یہ ممکن تھا کہ دو تین رپورٹروں کو Depute کردیں۔ وہ جائیں اور پورا کام کریں۔ اب کراچی میں اس وقت اسی کے قریب پولیس اسٹیشن ہیں۔ کوئی کرائم رپورٹر ان کو روزانہ ٹور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ ایک تھانے کو ایک دفعہ فون کرلیتا ہے۔ یا جہاں کی اس کو اطلاع مل جائے' وہاں ٹیلی فون کرلیتا ہے اس حوالے سے۔ تو اس طرح وہ چیک بھی نہیں کرسکتا کہ پورے شہر میں ہو کیا رہا ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد : ہاں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تشدّد اور ایذارسانی کے واقعات اس قدر زیادہ ہورہے ہیں کہ اخبارات کے وسائل بھی اتنے نہیں ہیں کہ ان کو لکھ سکیں ......

انور سن رائے : اخبارات میں Space بھی نہیں ہے ......

ڈاکٹر ہارون احمد : Space تو اس طرح ہوسکتی ہے کہ اگر چار لائنوں میں اس کو لکھ دیں ......

انور سن رائے : نہیں صاحب' چار لائن میں ہوگی تو آپ کہیں گے اس میں فالو اپ نہیں ہے' تفصیلات نہیں ہیں۔ اس کی نوعیت واضح نہیں ہوئی۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو مختصر کرکے بیان کردیا تو اس کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہارون احمد : ابھی آصف یہ کہہ رہے تھے' کہ انسان کا بنیادی حق ہے معلومات۔ تو ہمارے ہاں اخبار کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا بھی ہیں۔ تو اخبارات سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ آپ سنسنی خیزی کرتے ہیں یا ایسے واقعات نہ چھاپیں' لوگ ڈرتے ہیں۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ اگر معلومات نہ ہوں' تو حقائق کی غیر موجودگی میں انسانی فطرت ایسی ہے کہ انسان حقائق کو Invent کر لیتا ہے۔ اور Invented Truth ہے' وہ افواہ ہے۔ مطلب یہ کہ پھر وہ افواہ بری خبروں سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے' اس لیے کہ وہ بڑھ چڑھ کر اور سینہ بسینہ چلتی ہے ......

انور سن رائے : جو نہیں ہوا وہ بھی شامل ہو جائے گا اس میں۔

ڈاکٹر ہارون احمد : تو اس طرح میرے خیال میں یہ جو بھی واقعات ہیں' میڈیا کو لوگوں تک ان کو پوری ذمہ داری کے ساتھ پہنچانا چاہیے اور کسی حد تک Selective ہو کر فالو اپ بھی کریں۔ سب کا نہیں کر سکتے تو جو خبریں معنی خیز ہیں یا جن کا ہمارے شہر پر یا ہمارے ملک پر اثر پڑ رہا ہے' ان کا فالو اپ کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ حکومت وقت بھی چاہے گی کہ یہ بات ادھر ادھر ہو جائے ......

انور سن رائے : میں آپ کی توجہ کے لیے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب ۷۹ء میں میری کتاب "چیخ" کی تقریب رونمائی ہو رہی تھی تو اس میں رسول بخش پلیجو صاحب نے ایک واقعہ سنایا۔ ایک سیاسی کارکن کو گرفتار کیا گیا اور جب پوری کوششوں کے بعد اس کو عدالت میں پیش کیا گیا تو اس کی پیٹھ کا جو پچھلا حصہ تھا وہ سارا کٹا ہوا تھا۔ بلیڈ سے یا کسی تیز دھار آلے سے اسے پورا کاٹا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے ساتھ بہت زیادہ تشدّد کیا گیا تھا۔ پلیجو صاحب اس کے وکیل تھے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ تم یہ سب کچھ عدالت کو بتاؤ۔ تم بیان دو کہ تمہارے ساتھ کیسے تشدّد کیا گیا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس نے ایک موٹی سی گالی دی انتظامیہ کو' اور اس نے کہا کہ اگر یہ ہم بتائیں گے تو سیاسی شعبے میں کام کرنے والے دوسرے لوگ خوف زدہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا

اس کو چھوڑیں۔ اس پوری تفصیل کو رہنے دیں اور آپ اس کے بغیر کیس تیار کریں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ پہلو مد نظر رکھا جائے کہ ان تفصیلات سے خوف پیدا ہوگا اور جو لوگ اس شعبے میں کام کر رہے ہیں وہ اپنا کام بند کر دیں گے' تو پھر وہی معاملہ آجاتا ہے کہ اگر وہ تشدد جھیلنے والا یہ تفصیلات نہیں بتاتا تو تشدد کرنے والی مشینری کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ ہم اعتراف نہیں کرتے۔ اس ناول میں بہت سے واقعات ہیں ......

ڈاکٹر ہارون احمد: خصوصاً جنسی جرائم کی تفصیلات۔

انور سن رائے: سماجی طور پر اس لغت کا استعمال کرنا بھی غیر مہذب سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: یہاں میں عرض کروں گا کہ اصل میں مقصد کیا ہے ایذا رسانی کا۔ وہ یہ ہے کہ معلومات حاصل کرنا۔ سچ یا جھوٹ اعتراف یا کنفیشن حاصل کرنا۔ دکھاوے کا ٹرائل بھی کر دینا۔ وہ اس لیے کہ سیاسی اور سماجی طور پر گروپ چاہتے ہیں کہ معاشرے میں تبدیلی آئے' ان کو سبق سکھایا جاسکے۔ سبق سکھائیں اور خوف طاری ہو......

انور سن رائے: اور ان کو عبرت کی نشانی بنا دیا جائے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: بلکہ ان کی شخصیت مسخ ہوجائے تاکہ وہ کسی قابل نہ رہے۔ یہ تو اذیت رسانی کے مقاصد ہوئے۔ اب ان کو Counter کرنے کے لیے میڈیا کو کس طرح کام کرنا چاہیے۔ یہ بات صحیح ہے کہ خوف آپ اور بڑھا رہے ہیں ایک طریقے سے۔ لیکن اگر آپ اس کو صحیح طریقے سے بیان نہیں کرتے تو پھر آپ ایذا رسانی کرنے والوں کے ساتھ شامل ہیں۔ تو یہ ضروری ہے کہ آپ اس کو یوں پیش کریں کہ لوگوں کو معلوم ہو۔ جیسا کہ آصف نے کہا' معلومات لوگوں کا حق ہے کہ کیا ہوا' کیا واقعہ پیش آیا۔ یہ کہہ دینا کہ اس سے حکومت اور ایذا رسانی کی مشینری کا مقصد یہی ہے ...... لیکن اب جیسا آپ نے بتایا' یہ اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ آپ اس کو فالو اپ بھی نہیں کر سکتے۔

تو آپ اگر نہ بھی کہیں گے تو افواہوں کی شکل میں اور بھی زیادہ خوف و ہراس کا موجب ہوگی' بجائے اس کے کہ حقیقت معلوم ہو۔

انور سن رائے : اس میں ایک Gap ہے۔ مثلاً ہم نے شائع کیا کہ شہر کے فلاں فلاں علاقوں میں اس قسم کے واقعات رونما ہوئے اور دس Casualties ہوئی ہیں۔ اب اس کے جواب میں سرکاری ہینڈ آؤٹ آتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہلاک ہوا ہے۔ بہت ہی بریف ہوتا ہے' دس بارہ لائن کا۔ اس میں سے آپ کچھ حاصل نہیں کرسکتے۔ اور وہ اصرار کرتے ہیں کہ اصل صورت حال یہ ہے' وہ نہیں جو آپ لوگ شائع کررہے ہیں۔ تو یہ ہمارے لیے بہت Embarassing صورت حال ہے۔ مجھے گھر میں بھی تنقید کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے۔ میرا بیٹا مجھ سے کہتا ہے' "ابّو آپ کا اخبار تو بہت چھوڑو ہے۔ آپ کہتے ہیں دس آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔" تو مجھے اس چیلنج کا اپنے گھر میں سامنا تھا۔ اگلے دن میں نے فوٹوگرافر کو لگایا اور جتنی تعداد بتائی گئی تھی' ان کی تصویریں اور نام حاصل کیے۔ تو یہ خاطر خواہ شہادت تھی۔

ڈاکٹر ہارون احمد : ہاں صاحب' عام لوگوں کو خاطر خواہ طریقے پر اندازہ ہے کہ کراچی میں اگر کوئی واقعہ اس قسم کا ہوا تو سب کو معلوم ہے لیکن ٹی وی ریڈیو سے اس کا کوئی ذکر نہیں۔ تو سرکاری ہینڈ آؤٹ اور گورنمنٹ کنٹرولڈ میڈیا پر سے لوگوں کا اعتبار بہت کم ہوگیا ہے۔ پرنٹ میڈیا کو یہ Edge ہے کہ لوگ اگلے دن اخبار پڑھ کر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ شہر میں ہوکیا رہا ہے۔

آصف فرخی : ڈاکٹر صاحب اس میں ایک مشکل یہ ہے کہ حکومت نے اس کے بارے میں جس طرح کی بحث چھیڑی ہے اور جس طرح کے اعتراض اٹھائے ہیں کہ اخباروں میں سنسنی خیزی ہے یا ان اخباروں میں Coverage کیا ہے اور جس قسم کے حل پیش کیے جارہے ہیں کہ سرخی میں نہ آئے' تصویریں نہ ہوں' اندر کے صفحے پر ہو وغیرہ وغیرہ' تو مجھے لگتا ہے کہ وہ اس معاملے کو Trivialize کررہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ اس پوری صورت حال کو نیوز پیپر کی Space کے مسئلے کے طور کیوں دیکھ رہے ہیں۔ بنیادی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اخباروں

نے کس انداز سے لکھا بلکہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ایذا رسانی ہوئی کہ نہیں۔ کچھ لوگوں کو ٹارچر کیا گیا کہ نہیں۔ اور ایسا ہوا تو کیوں ہوا۔ مسئلہ اخبار کا نہیں مسئلہ شہر کا ہے۔ ہمارے معاشرے میں سوائے ان چند اخباروں کے' جو رسوا زیادہ ہیں' اس مسئلے پر باقاعدہ گفتگو یا مکالمہ یا تجزیاتی تبصرہ کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' یہ ہمیں بھی تو تبدیل کر رہا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ ہم مسخ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے عطیہ داؤد کی سندھی نظم کی چند سطریں یاد آ رہی ہیں' جن کا مفہوم کچھ اس طرح کا ہے: "سیاست دانوں کے منہ میں طوطے کی بولی ہے اور اخبار چڑیل کے ناخنوں سے روز میرے جسم سے گوشت کی ایک بوٹی نوچ لیتے ہیں" اور "خوشبو کو ٹارچر کیمپ میں ڈال دیا گیا ہے۔" تو کہیں ہم اس حد تک Brutalize تو نہیں ہو گئے کہ یہ تمام صورت حال ہمیں اب گفتگو کے قابل ہی نظر نہیں آتی ......

انور سن رائے: نہیں' آصف۔ یہ تو آپ زیادتی کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ۔ انہوں نے بہت پہلے جو سائیکاٹری کانفرنس منعقد کی تھی اس کا ایک حصہ مخصوص کیا گیا تھا تشدد کے حوالے سے ......

آصف فرخی: نہیں' نہیں' میں کچھ اور کہہ رہا ہوں ...... وہ کانفرنس ضیاء الحق کے زمانے میں ہوئی تھی۔ بڑی Relevant تھی۔ میں وہاں موجود تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمارا دانش ور طبقہ اور حکومت اس پوری صورت حال میں شام کے اخباروں کے کردار کے بارے میں صرف ایک پہلو کے حوالے سے بات کر رہے ہیں' لیکن اس کے پیچھے جو اصل مسئلہ ہے' اس پر کیوں نہیں سوچ رہے۔ شام کے اخباروں کا میں کچھ ایسا مداح بھی نہیں ہوں' لیکن اس مسئلے کو سیاہ اور سفید رنگوں میں تقسیم کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اب برا بھلا کہنے اور الزام دینے سے آگے جا کر بات کرنا ہو گی۔

انور سن رائے: حکومت تو یہ مانتی ہی نہیں کہ اس طرح کچھ ہو رہا ہے ......

آصف فرّخی : یہی تو بات ہے۔ یہ بھی اس مسئلے کا حصہ ہے ......

ڈاکٹر ہارون احمد : دیکھیے یہ میں بتادوں کہ ہم نے جو سیمینار کیا تھا کئی سال پہلے۔ اور بھی کئی لوگوں نے سیمینار کیے تھے ......

انور سن رائے : کراچی میں اس صورت حال سے کئی سال پہلے یہ سیمینار ہوا تھا ......

ڈاکٹر ہارون احمد : لیکن بات یہ ہے کہ ہمارے یہ جو کثیرالاشاعت اخبار ہیں، ان میں خبر تو آجاتی ہے لیکن اگر آپ ایڈیٹوریل پیج دیکھیں تو یہ جو واقعات ہورہے ہیں اور فرنٹ پیج پر آرہے ہیں، وہ Reflect نہیں ہوتے کہ کوئی تجزیہ پیش کیا جائے یا کوئی بات کی جائے کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس پر بات نہیں ہورہی ہے تو کیا یہ ڈر کی وجہ سے ہے یا ایڈیٹوریل مصلحت ہے، کیا ہے۔

انور سن رائے : دونوں باتیں ہیں۔ میں چوں کہ اس کا Insider ہوں اس لیے اپنی مشکلات بیان کرسکتا ہوں۔ باقی کیا ہوتا ہے، اس کا مجھے کم ہی علم ہے۔ پالیسی بھی ضرور حائل ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یہ دشواری ہے کہ لکھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ بہت سارے لوگ اس پر لکھنا پسند نہیں کرتے۔ جہاں تک ادارتی پالیسی کا تعلق ہے، میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ تشدّد کے مختلف پہلوؤں کو ہر واقعے کے بعد اداریے میں ضرور اٹھایا جائے اور کوشش کی ہے کہ جس حد تک ہمیں سمجھ میں آیا ہے، اس کا مشورہ بھی دیا ہے۔ حالانکہ ہمارا مشورہ کوئی سنتا بھی ہے کہ نہیں یا ہم صرف خود ہی لکھ کر پڑھ لیتے ہیں۔ ہم پھر بھی کوشش کرتے ہیں کہ حکومت کو بتایا جائے کہ اس کے مجموعی طور پر کیا اثرات مرتّب ہوں گے اور ہم کس بڑی تباہی سے دوچار ہوسکتے ہیں۔ لیکن بالعموم ایسا نہیں ہے۔

آصف فرّخی : ایسا کیوں نہیں ہے۔ یہ صرف چند افراد کا، میرا، آپ کا اور ڈاکٹر صاحب کا مسئلہ تو نہیں ہے۔ یہ تو اجتماعی بقاء کا مسئلہ ہے ...... بہر حال،

میرے لیے یہ ایک ذاتی مسئلہ تو ہے۔ اور انور سن رائے کی طرح میں بھی اس کو سب سے پہلے ذاتی مسئلے کے طور پر دیکھتا ہوں۔ میرا مسئلہ یوں بگڑتا ہے کہ میں چند ایک ٹوٹی پھوٹی کہانیاں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اب میرے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں اس پوری صورت حال سے پہلو بچا کر نکل جاؤں۔ اس طرح لکھوں جیسا یہ سب Exist ہی نہیں کرتا، کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ لیکن میرے لیے اتنی بڑی خود فریبی ممکن نہیں ہے۔ اور پھر دوسری طرف ان چیزوں کے بارے میں علم نہیں، تجربہ نہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ قلم میں اتنی طاقت نہیں۔ تو میں نہ تو ان سے نظریں بچا سکتا ہوں نہ آنکھیں چار سکتا ہوں۔ ایک عجیب تعطل کی کیفیت میں گرفتار ہوں اور سوچتا رہتا ہوں کہ پس چہ باید کرد۔

انور سن رائے: ادب کے حوالے سے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ جتنی بھیانک اور جس قدر تحریک دینے والی یہ صورت حال ہے، اس قدر لکھا نہیں گیا۔ یہ ایک نئی صورت حال تھی اور ہمارا روائتی ادب جو ہے، اس کی جمالیات میں بھی اس کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے لوگوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ غیر جمالیاتی اظہار ہونے کی وجہ سے یا روایت میں پہلے سے اس کی شکل نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے دوسرے موضوعات پر توجہ دی ہے۔ تھوڑا بہت جو لکھا گیا ہے، وہ بکھرا ہوا ہے۔ اس کو جمع کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ جب ایک خاص طرح کی دل چسپی بن جاتی ہے تو پھر آپ ڈھونڈتے اور دیکھتے رہتے ہیں کہ اچھا، اس طرح بھی لکھا گیا ہے۔ دبی دبی سہی، لیکن اس اظہار کی آواز ضرور ہوتی ہے۔ کراچی میں بہت ساری ایسی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ شاعری میں بھی اور افسانے میں بھی۔ سندھی میں بھی ہیں اور اردو میں بھی۔ لیکن زیادہ موثر ذریعہ تو اخبارات ہی ہیں۔ ادب میں جو چیزیں رونما ہوتی ہیں وہ دیرپا ریکارڈ کے طور پر محفوظ ہو جاتی ہیں۔ تاریخ کے کام آسکتی ہے، تحقیق کے کام آسکتی ہے۔ لیکن اخباروں میں جو چیز ہوتی ہے، فوری طور پر سامنے آتی ہے اور فوری ردِعمل کو بھی منظم کرتی ہے۔ اخباروں کا رول اس لیے اہم ہے۔ ہماری ہاں آزادی اظہار کی صورت حال بہت بہتر ہوئی ہے ...... میں زور

دے کر کہوں گا کہ بہت بہتر ہوئی ہے ...... لیکن اتنی بہتر نہیں جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ سنسر شپ کا جو دور تھا وہ ہمارے اندر اتر گیا ہے۔ سیلف سنسر شپ اتنا طاقت ور ہوگیا ہے کہ اس سے نکلنا ان لوگوں کے لیے تو ناممکن ہوگیا ہے جنھوں نے میرے ساتھ جرنلزم کا آغاز کیا تھا۔ اب جو نئے لوگ آئے ہیں انہیں سنسر شپ کا تجربہ نہیں ہے' لہٰذا ان کے ہاں یہ نہیں ہے۔ ان کے اوپر جو سینئر لوگ بیٹھے ہیں' ان کے اندر یہ بات بہت زیادہ سرایت کرگئی ہے' ان کے ہاتھ سے کسی خبر کا سنسر شپ سے گزرے بغیر نکلنا ممکن نہیں رہا۔ دس لفظ لکھے جائیں گے تو میرا ہاتھ خود بخود ان میں سے چند لفظ کاٹ دے گا۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں ان کا لکھا جانا ضروری ہے۔ پھر ایک مسئلہ لغت کا بھی ہے۔ اس کے اظہار کے لیے ہم جو لفظ استعمال کرنا چاہتے ہیں' ہماری عمومی اخلاقیات میں اس کی گنجائش اب تک پیدا نہیں ہوئی ہے۔ ہم اس سے خوفزدہ ہوجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ شاید سارے سماج کی تباہ کاری ہے۔ یہ لفظ اس میں شامل کردیے جائیں گے تو یہ گھر میں نہیں پڑھا جاسکے گا۔ اس کی بھی ہمارے ہاں روایت ہے کہ بہت سارے مسائل ہیں جن پر ہمیں کھل کر بات کرنی چاہیے لیکن ہم گھر میں یہ بات نہیں کرتے ہیں۔ بیٹی یا بیٹا باپ سے کھل کر بعض باتیں نہیں کہہ سکتا۔ اس کی وجہ سے بہت سی نفسیاتی اور سماجی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ یہی چیز اخبارات میں بھی ہے۔ وہاں بیٹھتے ہیں تو فیملی پریشر نظر آتا ہے' سوسائٹی کا پریشر نظر آتا ہے' پھر ایک سیاسی دباؤ سامنے کھڑا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی بہت سی چیزیں سامنے نہیں آتیں۔

آصف فرخی : لیکن جب تشدد ہوتا ہے تو Violence چیزوں کو توڑتی ہے۔ ان میں یہ حد بندیاں بھی ٹوٹتی ہیں۔ اب زبان ہی کی مثال لیجیے۔ اس ناول کے ترجمے میں جو زبان استعمال ہوئی ہے' وہ مجھے ایجاد نہیں کرنی پڑی بلکہ اپنے اردگرد سے مل گئی۔ کیوں کہ یہ صورت حال ہمارے ہاں آچکی ہے' اس لیے اس کے اظہار کی زبان بھی سامنے آگئی اور بیان کا پیرایہ بھی مل گیا۔ یہ ضرور ہے کہ اس زبان پر لوگوں کو شاید اعتراض ہو۔ لیکن یہ زبان اس صورت حال کی پیدا کردہ ہے۔ جسمانی حصوں کے نام اور بعض تفصیلات اس تکلیف کا اور

تشدّد کا حصہ ہیں۔ تو صرف اخلاقیات کے نام پر آپ اس زبان پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ یہ درد کی زبان ہے' یہ دکھ کی زبان ہے اور تشدّد کا نشانہ بننے والوں کی زبان ہے۔

انور سن رائے: دیکھیں ناں' میں نے ''چیخ'' میں جس بات کی کوشش کی اور جس کے لیے بہت زیادہ ملامتی خطوط بھی وصول کیے اور میرے قریبی لوگوں نے بھی شدید اعتراض کیے کی بھئی یہ کیا ہے' ادب کی زبان اس طرح نہیں ہوتی۔ آپ کو علم ہے اس بات کا۔ لیکن اس کے بغیر چارۂ کار نہیں تھا۔ اب اس ترجمے میں جو زبان استعمال ہوئی ہے' اس پر بہت شدید اعتراض ہوگا۔ آپ کو احساس ہے اس بات کا؟ لیکن اس کا متبادل لفظ کیا لائیں گے؟ اس کو اگر کسی اور طریقے سے اظہار دیتے ہیں تو اس کی اصل روح اور واقعے کی شدّت ختم ہوجاتی ہے۔

آصف فرخی: اس زبان کی اہم ترین بات اس کی تکلیف ہے۔ اس میں ایک تکلیف پنہاں ہے۔ اور پھر اس ناول کی جو کہانی ہے کہ اس پادری کو جوں جوں واقعات کا علم ہوتا جاتا ہے' وہ ایک نفسیاتی کیفیت کا شکار ہوتا جاتا ہے۔ تو اس زبان کا ترجمہ کرنے میں بھی مجھے یہ لگا جیسے میرے اوپر تشدّد ہو رہا ہے اور میں بڑی تکلیف میں ہوں۔ میں اس کا ترجمہ کرتا تھا اور پھر ایک آدھ صفحے کے بعد رکھ دیتا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں صدمے سے دوچار ہوا ہوں۔ پڑھنے والا بھی اس صدمے سے گزرتا ہے۔

انور سن رائے: یہ ناول اس اعتبار سے بہت اچھا ماڈل ہے کہ ایسی چیز کا ہونا' اور اس کی شخصیت پر کیا اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ پھر دوسرے فرد کا اس کو پڑھنا اور پڑھتے ہوئے اس پر کیا اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ تیسرا فرد جو اس کو لکھتا ہے' اس کے بارے میں ہمیں ناول سے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن پادری کا کردار جو ہے' وہ جوں جوں پڑھتا جارہا ہے' وہ Disorder اس میں رونما ہوتا جارہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے ملازمہ سے تعلقات منقطع ہوتے ہیں' اس کے سرمنز کا انداز تبدیل ہوجاتا ہے اور وہ آخر میں بالکل ایک منتشر

شخصیت کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ انتظار کی اصل حقیقت تک رسائی کے لیے منتشر شخصیت کا وسیلہ ضروری ہے۔ جب تک آپ اس Disorder میں شامل نہیں ہوں گے' اس کی اصل ماہیت کو آپ اپنے شعور میں نہیں لا سکتے۔

ڈاکٹر ہارون احمد : اس میں پادری کا جو کردار ہے' اس کو Generalize کر کے میں کہوں گا کہ وہ میں' آپ یا عام قاری ہے۔ کیوں کہ جس قسم کی معلومات اس کو حاصل ہیں' وہ عام لوگوں کو نہیں ہیں' ہمارے شہر کے لوگوں کی نہیں ہیں۔ لیکن یہاں ایک مرحلہ آتا ہے جہاں وہ خود مریض بن جاتا ہے اور اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہوں گا کہ جو اثرات اس پادری پر ہوئے' اس کا سمجھ لیجئے کہ ایک فی صد اثر ہمارے ہاں عام لوگوں پر تو ضرور ہی پڑ رہا ہے۔ لیکن ہمیں طریقہ نہیں آتا کہ یہ معلوم کر سکیں کہ ان سب باتوں کا ردعمل کیا ہوگا۔ اور اس کے زیر اثر ہمارے معاشرے میں کیا ذہنی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ جیسے یہ تو معلوم ہے کہ تشدّد یا ایذارسانی کے اثرات کیا ہوتے ہیں۔ میں طبّی نفسیات کے طالب علم کی حیثیت سے کوئی پچیس تیس سال سے جو کیس دیکھتا رہا ہوں' تو میرے پاس ریکارڈز ہیں کوئی پندرہ بیس سیاسی قیدیوں کے جو میرے زیر علاج رہے' اور ابھی تک ان سے میرا رابطہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اوپر کیا اثرات پڑے ہیں۔ ایک کتاب بھی تیار ہوئی' چوں کہ ان کی مرضی تھی پھر ان کے مشورے سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی' تو وہ مولانا جاوید نعمانی کی کتاب ہے۔ لیکن اور بھی کیس ہیں جن کو میں فالو اپ کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت میں کیا تبدیلی آئی ہے۔ اس میں عام طور سے یہ ہے کہ جس شخصیت کو اذیت پہنچائی جاتی ہے یا جو شخص اس اذیت کا مشاہدہ کرتا ہے' دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے اس کے اوپر بھی اس کے اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں اس کو ہسٹریا یا ڈپریشن کہا جاتا تھا لیکن اب اس کو نام دیا گیا ہے Post-Traumatic Stress Disorder اور اس میں خاص بات یہ ہے کہ اس اذیت کو جو اس پر گزری ہے یا اس نے دیکھی ہے' اس اذیت کا بار بار احساس' مستقل ڈر کی کیفیت' بے

خوابی یا بدخوابی، ہیلوسی نیشن، Delusion، بے زاری، توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت کم ہوجانا، یاد داشت پر اثر، یہ چیزیں اس میں ہوتی ہیں۔ بہت سے لوگ جو اس سے متاثر ہوئے ہیں ان میں فیملی کے افراد یا پڑوسی، یا اگر میں نے آپکا اخبار پڑھا اور میں نے اسے محسوس کیا تو ان سب پر بھی، اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ابھی ہمیں یہ نہیں معلوم کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے پچھلے چند سال سے تو اس نسل کے اوپر کیا نفسیاتی اثرات مرتب ہوں گے۔

آصف فرّخی: یہ تو ایک فرد کا معاملہ ہوگیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ Disorder اجتماعی طور پر لاحق ہوجائے اور کوئی پوری آبادی اس میں مبتلا ہو۔ یہ سوال میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے کبھی کبھی کراچی شہر پر یہ شک ہونے لگتا ہے کہ اس شہر کو نفسیاتی عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: دیکھیے میں یہی عرض کر رہا تھا آپ کی کتاب کے حوالے سے کہ پادری پر جو اثرات مرتب ہوئے تو چوں کہ وہ بہت قریب تھا ان سب واقعات سے اس لیے وہ اس حد تک پہنچ گیا۔ ہمارے ہاں جب کسی کو نفسیاتی مریض کہا جاتا ہے تو وہ بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جن کو ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہیں یا Mentally Ill ہیں۔ اور وہ پانچ سے لے کر دس فیصد ہیں۔ لیکن پچیس سے تیس فیصد لوگ بہت سے نفسیاتی مسائل سے گزر رہے ہیں۔ لیکن وہ اس حد تک نہیں پہنچے کہ انہیں ذہنی امراض کے اسپتال بھیج دیا جائے۔ تو یہ اجتماعی اثر کی بات آپ کر رہے ہیں تو اجتماعی اثر ضرور ہوتا ہے، ان کی کارکردگی پر اثر ہوتا ہے، ان کی شخصیت پر اثر ہوتا ہے، ان کی خواہشات پر اثر ہوتا ہے اور معاشرے سے ان کا جو رشتہ ہے، اس پر اثر پڑتا ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جو محسوس کرتے ہیں، جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ کیفیت ان پر اثرانداز ہوتی ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو تقریباً پچیس فیصد لوگ ہیں، ان پر اثر ہوتا ہے تو ان کے ذریعے سارے معاشرے پر اثر ہوتا ہے یہ Post-Traumatic Stress Disorder کی اجتماعی صورت ہے۔ اس پر ابھی زیادہ کام نہیں ہوا ہے لیکن میں

سمجھتا ہوں کہ اس پر ہمارے ہاں کام ہونا چاہیے اس لیے کہ اس کے اثرات بہت جلد مرتّب ہونے والے ہیں۔

انور سن رائے : ڈاکٹر صاحب، میں اس کو اپنے طور پر دیکھتا ہوں جو مختلف طریقے اب ہمارے ہاں موجود ہیں۔ آپ سڑک پر جائیں تو بہت سے لوگ غیر ضروری ہارن بجاتے ہوئے ملیں گے۔ یا انہیں آپ کو اوورٹیک کرنا ہے تو آسانی سے بھی کرسکتے ہیں، لیکن خاص طور پر اوورٹیک کرتے ہوئے زور زور سے ہارن بجائیں گے۔ پھر ٹریفک کی خلاف ورزیوں کا رکارڈ ہم نے کبھی اس طرح دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ کسی خاص زمانے میں یہ خلاف ورزیاں زیادہ ہورہی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ عمومی جمہوری زمانے میں دیکھیں اور آج کل ٹریفک کی خلاف ورزیاں دیکھیں تو آج کل یہ باتیں بہت زیادہ ملیں گی۔ جہاں جہاں تشدد کی کاروائیاں ہوں گی وہاں سماجی Violations کا رکارڈ بہت زیادہ ہوگا۔ تو ہم نے اس طرح کی Assess کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر ہم بیماری کو بیماری بھی اسی وقت سمجھتے ہیں جب وہ جسمانی طور بہت واضح ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد : یہ جو آپ نے فرمایا ٹریفک کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے تو اس کا بھی ایک پہلو غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ مثلاً میں کوئی Rule توڑتا ہوں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ It Gives Me Power۔ آپ ایئرپورٹ آجائیں اور کسی سے کہہ کر اندر چلے جائیں تو You Feel Great۔ اور اگر آپ باہر کھڑے رہ جائیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ لاوارث ہیں۔ اسی طرح کوئی بھی قانون ہو......

انور سن رائے : تو اس کو توڑنا سماجی تفاخر کی علامت بن گیا ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد : جی ہاں۔ چینی ایک زمانے میں کم تھی، تو اگر کسی کے پاس تھوڑی سی زیادہ چینی ہے تو وہ پکڑ لیا جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا سا کسی کے پاس چھوٹا موٹا اس قسم کا سامان ہے تو وہ پکڑ لیا جاتا تھا، لیکن اگر کسی کے پاس بہت بڑا اسلحہ خانہ ہے تو وہ محفوظ رہتا ہے۔ تو ہمارے قانون کا جو اطلاق ہے وہ

ہمیں ایک بات سکھاتا ہے کہ اگر ہم نے کوئی قانون توڑ لیا اور ہم بچ گئے تو اس طرح ہم نے اپنا لیول کچھ بلند کر لیا ہے۔ تو یہ ایک فیڈ بیک ہے اور ہمارے شہر میں سڑک پر جو آپ دیکھتے ہیں، وہ یہی ہے کہ فلاں شخص یہ کر سکتا ہے... مثلاً ٹریفک روک دی گئی اور ایک گھنٹے کے لیے روک دی گئی کہ فلاں صاحب گزر رہے ہیں، تو میں کیوں نہیں یہ ٹریفک سگنل توڑ کر نکل جاؤں؟ میں بھی سمجھوں گا کہ میں کچھ کر گزرا۔ مطلب یہ کہ اس طرح کی سائیکی ڈیویلپ ہوگئی ہے۔

انور سن رائے: میں اس سلسلے میں ایک واقعہ سناتا ہوں، جو دلچسپ بھی ہے۔ ایک صاحب ہیں ہمارے ہاں جو صرف چند دنوں کے لیے وزیر اعلا بنے، قائم مقام وزیر اعلا۔ ان سے اتفاق سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اب آپ کو کیسا لگتا ہے۔ اب تو حالات بھی تبدیل ہوگئے اور آپ کی سیاست کا دور بھی ختم ہوگیا۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ سب صحیح ہے لیکن دل نہیں کرتا اس کو چھوڑنے کو۔ میں نے کہا کہ اب تو آپ کبھی بھی منتخب نہیں ہوسکتے اس طرح کی صورت حال میں۔ تو انہوں نے کہا کہ میں منتخب چاہے نہ ہوسکوں، لیکن اب میں اس کیفیت سے نکل نہیں سکتا۔ وہ جو تین دن میرے ساتھ اسکواڈ چلتا تھا اور یہ گل بہار کا علاقہ جس کی سڑکوں پر سے میں روزانہ گزر کر آتا تھا اور بس میں بیٹھ کر سفر کرتا تھا وہاں سب لوگ کھڑے ہوئے تھے اور ہارن بجاتی ہوئی گاڑی گزر رہی تھی جس میں میں بیٹھا ہوا تھا تو یہ کیفیت ساری زندگی مجھے اس سے نکلنے نہیں دے گی۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ قانون توڑنا ...... جب ریاست خود قانون توڑتی ہے اور قانون سے بالاتر اقدامات کرتی ہے تو عام آدمی کے لیے بھی ماڈل وہی بنتا ہے ......

ڈاکٹر ہارون احمد: عام آدمی اس سے سیکھتا ہے۔

آصف فرخی: عام آدمی اس طرح اپنے تئیں حکومتی عمل میں Participate کرتا ہے۔

انور سن رائے: وہ اسی پر عمل کرتا ہے اپنی زندگی میں کہ یہی ایک طریقہ ہے اپنے آپ کو بالادست ثابت کرنے کا، یا اپنے احساس محرومی سے نجات

حاصل کرنے کا۔

آصف فرّخی: شاید تشدّد کا معاملہ بھی یہ ہوا ہے......

ڈاکٹر ہارون احمد: بالکل، تشدّد سے وہ اپنے اندر قوت آتی ہوئی محسوس کرتا ہے اور بے یقینی کی جو کیفیت ہے، اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب تک ہم نے یہ بات کی ہے کہ اس کے اثرات خوف، دہشت وغیرہ ہیں، لیکن اس کے کچھ دوسرے پہلو بھی ہیں۔ ہر ڈرائنگ روم میں اس پر بات ہوتی ہے، لیکن یک جا ہو کر بات نہیں ہو پاتی۔ آپ غور کریں کہ چھوٹے چھوٹے گروپ ہیں جنہوں نے پچھلے دنوں اس پر سیمینار کیے۔ دو چار سال پہلے یہ بات نہیں تھی۔ تو یہ باتیں محرک ثابت ہوئی ہیں۔ خوف اپنی جگہ، لیکن ایک ساتھ ہو کر کچھ لوگوں نے بات کی ہے تو اس کی اہمیت ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بھئی سیمینار سے کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ان لوگوں کی اپج ہے کہ اپنے طور پر بات کر رہے ہیں۔ لیکن کوئی ایک پلیٹ فارم اس طرح ابھی تک بن نہیں پایا جو انسانیت اور انصاف اور انسانی حقوق کے حوالے سے بات کر سکے اور جو طور طریقہ ہے ہمارے حکمرانوں کا، اس پر پریشر ڈال سکے۔ تو یہ خوش آئند بات ہے کہ اس طرح چھوٹے پیمانے بات ہونا شروع ہوئی ہے۔ ابھی ہمیں محسوس نہیں ہو رہا لیکن آئندہ چل کر اس کا پریشر پڑے گا۔ اس ناول کے پس منظر میں یہ بات ہے۔

آصف فرّخی: اس ناول کے ترجمے کا جواز بھی یہی تھا کہ اس قسم کی گفتگو کو انگیخت کر سکے اور ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس کے لیے ایک استعارہ فراہم ہو سکے۔

انور سن رائے: لیکن کچھ اور پہلو بھی ایسے ہیں اور ضرورت ہے کہ تشدّد کے حوالے سے ان پر غور کیا جائے۔ تشدّد کے سیاسی عوامل۔ تشدّد کے اقتصادی عوامل۔ تشدّد کے سماجی عوامل اور تشدّد کے جمالیاتی عوامل۔ یہ بنیادی باتیں ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ہمارے ہاں ...... کل رات میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا..... ایک تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاسی عوامل ہیں، میں جس

بات کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں وہ یہ کہ ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں
کو ان کے فرائض سے ہٹا کر سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ جب
ان کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو ان کو اپنے دائرہ کار سے
تجاوز کرنے کا ایک جواز مل جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ استعمال ہی ان کا تجاوز بن
جاتا ہے۔ پولیس اگر ایک ادارہ ہے تو اس کا کام بنیادی طور پر لوگوں کو تحفظ
فراہم کرنا ہے اور لاقانونیت اختیار کرنے والوں کے خلاف کاروائی کرنا ہے۔
لیکن جب ان کو قانون کی خلاف ورزی نہ کرنے والے پر بھی قانون کی خلاف
ورزی مسلط کرنے کا استحقاق اور اختیار دیا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ
بناؤ' تو ان کے لیے ایک راستہ بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے یا
گروہی مقاصد کے لیے یا ادارتی مقاصد کے لیے بھی اس طریقہ کار کو استعمال
کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی نظام کا غیر جمہوری ہونا۔ ہمارے ہاں
بدقسمتی سے یہ عرصہ زیادہ رہا ہے اور جمہوری نظام ابھی تک ابتداء نہیں کرپایا
ہے۔ ظاہر میں تو اس کی شکل رہی ہے لیکن حقیقتاً اس کا تجربہ نہیں ہو پایا۔
جمہوریت کی طرف ہم جاتے ہیں' پھر پیچھے ہٹ آتے ہیں۔ اس کے علاوہ
لوگوں کے بنیادی حقوق کا مجروح ہونا۔ آزادی اظہار' آزادی تحریر و تقریر کا
سلب کیا جانا۔ پھر ایک اور چیز ہے' وہ ہے ہماری انتظامی ساخت' جس میں مجھے
بعض وقت بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے کہ ہر چھوٹا افسر' اس کے اوپر
بڑا افسر' یہ سب ایک دوسرے کے اوپر ایک طرح کی ذاتی حکمرانی' ادارتی نظم و
نسق کو معطل کر کے' مسلّط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کا آغاز اس
طرح سے ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی غیر منتخب قیادت ابھر کر آتی ہے تو وہ اپنے
اختیار کو اپنے دائرہ کار سے بڑھ کر مسلط کرنے کی کوشش کرتی ہے' اور یہ پھر
اوپر سے نیچے تک آتا ہے۔ ایک اعلا افسر ہے' وہ اپنے پیچھے والے افسر کے لیے
وہی طرز عمل اختیار کرتا ہے' اور پھر یہ ردعمل بالکل گراس روٹ میں عام
لوگوں تک چلا جاتا ہے۔ اچھا' انتظامی اداروں میں اختیارات اور مراعات کا
عدم توازن ہے' یہ بھی تشدّد کا ایک بنیادی سبب ہے۔ ایک پولیس مین ہے'
اس کے پاس اختیارات تو اتنے ہیں کہ وہ کسی بھی شخص کو بغیر کسی منطقی جواز

کے، کسی وقت بھی اٹھا کر بند کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے اپنے اقتصادی وسائل اتنے کم ہوتے ہیں کہ ایک طرح سے اس کے اندر کمپلیکس پیدا ہوسکتا ہے کہ جس آدمی کو میں گرفتار کر سکتا ہوں، اس کے پاس تو اتنے وسائل ہیں اور میں جو گرفتار کرنے والا ہوں میرے وسائل اتنے کم ہیں کہ میں اپنے بچوں کی پرورش بھی صحیح طریقے سے نہیں کر سکتا۔ تو یہ عدم توازن ہے۔ پھر روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی بھی مجھے اس کا ایک بڑا سبب محسوس ہوتا ہے۔ سماجی عوامل میں، آلودگی کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ Noise Pollution خاص طور پر۔ ویسے عمومی طور پر آلودگی بھی ہماری شخصیت میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرتی ہے جن کا ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تشدد گھر کے اندر اور تشدد گھر کے باہر دونوں جگہ ہوتا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ شہریوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے درمیان اعتماد بالکل ختم ہوچکا ہے۔ اگر میرے ساتھ کوئی زیادتی ہو بھی، تو میں قانون نافذ کرنے والے اداروں سے گریز کرتا ہوں۔ اب وہ اعتماد ہی نہیں رہا۔ اسی طرح اگر مجھے پانی کے حاصل نہ ہونے کی شکایت ہے تو میں اس ادارے تک نہیں جاتا۔ میں دس جگہ اس کا رونا روتا رہتا ہوں لیکن اس مخصوص ادارے تک نہیں جاتا اس لیے کہ مجھے پتہ ہے وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کچھ نہیں کرے گا۔ تو اعتماد کا مجروح ہونا ایک بات ہوئی۔ تیسری بات یہ ہے، جس پر ہم نے کوئی خاص توجہ نہیں دی، خاص طور پر کراچی کے حوالے سے، وہ یہ کہ ہمارا فن تعمیر یکسر تبدیل ہوگیا ہے۔ دوسرے شہروں کے مقابلے میں ہم اوپر اٹھتے ہوئے اور بند عمارتوں، دفتروں اور مکانوں میں وقت گزارتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ سے بھی بہت بڑے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ Isolation ہماری سائیکی میں بہت زیادہ آگیا ہے۔ اور اس سے ہمارے سماجی تعلقات اور باہمی رابطوں میں بھی رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ پھر لوگوں کے ایک جگہ جمع ہونے کے جو مواقع تھے وہ بھی بتدریج کم ہوتے جارہے ہیں۔ ایسی سماجی تقریبات کم ہوتی جارہی ہیں جن میں لوگ ملتے تھے اور تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ اب تو حالات اتنے بگڑ گئے ہیں کہ ویسے ہی لاء اینڈ آرڈر سچویشن کی وجہ سے اکٹھے نہیں ہوپاتے۔ لیکن

ایک سوشل فینومینا کے طور پر میل جول اور گفتگو کا یہ انداز ہمارے ہاں ختم ہوتا جارہا ہے۔ پھر مواصلاتی نظام انتہائی ناقص ہے۔ شہر میں بسیں ایسی ہیں اور لوگوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے آنے میں رکاوٹیں اتنی ہیں کہ وہ گھر سے نکلنے سے گریز بھی کرنے لگے ہیں۔ مطلب یہ کہ رابطے کی جگہ آہستہ آہستہ Isolation آتا جارہا ہے۔ اس Isolation کو ہماری ثقافتی صورت حال اور بڑھا رہی ہے۔ تعلیمی سہولتوں کا جتنا فقدان ہے اس کا بھی اثر پڑتا ہے۔ ادبی صورت حال بھی ایسی ہے کہ ادبی جرائد ختم ہوگئے ہیں اور جن کے پاس وسائل ہیں صرف وہی کتابیں شائع کرسکتے ہیں اور اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ بہت ساری ایسی چیزیں شائع ہونے سے رہ جاتی ہیں جن کی وجہ سے ایک جمالیاتی تعلق پیدا ہوسکتا تھا۔ تو تشدّد کے بنیادی اسباب کے علاوہ ان باتوں سے بھی فرق پڑتا ہے۔ اس کتاب میں ان کا حوالہ براہ راست تو نہیں ہے، لیکن ضمناً ہم ان باتوں کے حوالے ضرور دے سکتے ہیں، مثلاً پادری کا سماجی تعلق اس خاندان سے ختم ہوجاتا ہے جس کو افلاس کے باوجود وہ ایک طرح کا روحانی تحفّظ فراہم کرتا ہے۔ لیکن جو تشدّد کرنے والے ادارہ ہے اس رابطے کو بھی منقطع کرنا چاہتا ہے، وہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ رابطہ برقرار رہے گا تو یہ خاندان جو Isolation کی وجہ سے تشدّد کا زیادہ شکار ہوا ہے۔ تو یہ ادارے اس وجہ سے ان کے رابطے ختم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی وجہ سے اس خاندان پر لوگوں کی نظر پڑسکتی ہے کہ یہ بھی تشدّد کی ایک شکل ہے۔ تو تشدّد کی یہ شکل ہمارے ہاں بہت زیادہ آگئی ہے اور اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ہارون احمد: میں تصدیق کرتا ہوں، کیوں کہ ماحول کا اثر تشدد پر بہت گہرا ہے اور جیسا کہ آپ نے فرمایا، یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے۔ ہمارے ہاں Lead Level بہت زیادہ ہے اور اس کے اثرات کا جائزہ لیا جاچکا ہے کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ ماحول کے اثرات میں Over- Crowding اور رہائش کے مسائل، شور وغیرہ شامل ہیں۔ پھر یہ کہ بنیادی ضروریات جو ہیں، Basic Needs ان کا فقدان ہے۔ بجلی بھی اب بنیادی ضروریات میں شامل ہوگئی ہے۔ پانی اور رہائش کے علاوہ Commute کرنے کا مسئلہ ہے کہ ایک شخص

آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے اور تین چار گھنٹے اسے آنے جانے میں لگتے ہیں، دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام۔ اس کے بعد اس کا اپنے خاندان سے رشتہ کتنا استوار ہوتا ہے، یا نہیں ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کا بھی تشدّد پر اثر پڑتا ہے۔ ایک بات جو آپ نے پہلے کہی، وہ یہ کہ انتظامیہ کا کردار کیا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جو حکومت ہمارے ہاں آتی ہے اس کو یقین نہیں ہوتا کہ دوسری مرتبہ بھی ہم منتخب ہوکر آسکتے ہیں، تو پھر ہوتا یہ ہے کہ انتظامیہ دو میں بٹ جاتی ہے اور پھر یہ کیفیت ہوجاتی ہے کہ اپنے مخالفین پر تشدّد کیا جائے۔ اس میں پولیس بھی شامل ہوجاتی ہے، انتظامیہ بھی اور سیاسی پارٹی بھی کہ ایک ساتھ مل کر ہر حال میں حکومت کو قائم رکھیں اور اس فائدہ اٹھاتے رہیں اور اس حکومت کو قائم رکھنے کے لیے تشدد کو بھی ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

انور سن رائے: آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ میں اس کا ایک تازہ حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ ابھی وزیر اعظم صاحبہ نے فرمایا کہ قائد حزب اختلاف کا دوبارہ اقتدار میں آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس پورے بیان کے تناظر میں یہ بات لاتعلق سی لگتی تھی۔ اس تقریر کو پڑھ کر مجھے یہ لگا کہ شاید ان کو ابھی ایڈمنسٹریشن پر پورا کنٹرول نہیں ہے۔ تو دراصل وہ ایڈمنسٹریشن سے مخاطب ہیں کہ ان کے اقتدار میں آنے کا چانس نہیں ہے تو آپ اپنا قبلہ درست رکھیں۔ آپ اگر یہ سوچ کر اس کی حمایت کر رہے ہیں کہ کل کو وہ بھی اقتدار میں آسکتا ہے، یہ حمایت بند کر دیں۔

آصف فرّخی: انتظامیہ کے دو دھڑوں کے درمیان اگر ایک قسم کا تضاد چل رہا ہے یا Adminisitrative Split ہے تو یہ Split اپنے آپ کو تشدد اور اذیت رسانی کی شکلوں میں بھی ظاہر کرتی ہے۔ جس طرح اسکیزوفرینیا کا مریض تشدّد پر اتر سکتا ہے۔

انور سن رائے: اصل بات یہ ہے کہ اگر ہم اپنے اختیارات سے تجاوز نہ کریں تو ہمیں یہ مشکلات پیش نہ آئیں۔ یہ بیان از خود اس بات کی شہادت

ہے کہ ہم کوئی ایسی چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ویسے حاصل نہیں ہوسکتی۔ پولیس والا حکومت اور حزب اختلاف کو مساوی نہیں سمجھتا۔ اگر وہ یہ سمجھے کہ یہ بھی شہری ہے اور جمہوری نظام کے تحت کل کو یہ بھی اقتدار میں آسکتا ہے تو وہ پھر Violation نہ کرے۔ تو آپ مجھے یہ کہہ کر Violation پر اکسا رہے ہیں کہ اسے کبھی اقتدار میں نہیں آنا۔

ڈاکٹر ہارون احمد: جمہوری نظام میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ حزب اختلاف، Goverment In Waiting ہے ......

انور سن رائے: اس سے پہلے وہ خود یہ کہہ چکی ہیں کہ کل میں حزب اختلاف میں بیٹھی تھی اور آج یہاں ہوں۔ کل یہ صاحب میری جگہ حکومت میں آسکتے ہیں۔ تو ہمیں جمہوری نظام کا یہ بنیادی اعتبار قائم کرنا ہے۔

آصف فرّخی: ہاں، لیکن ہمارے ہاں یہ سوچ ہے کہ وہ صاحب اقتدار میں بھی آسکتے ہیں لیکن ہم انہیں آنے نہیں دیں گے۔ اور اس امکان کو ختم کرنے کے لیے حکومت بے دریغ تشدد استعمال کرتی ہے۔ لیکن زیادہ تکلیف وہ بات یہ ہے کہ یہ ریاستی تشدّد صرف حزب اختلاف یا انتظامیہ کے مخالف دھڑوں کے خلاف ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ حکومت اسے عوام کے خلاف بھی استعمال کرتی ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب نے جو بنیادی ضرورتوں کی بات کی تو اس سے مجھے کچھ اور خیال آیا۔ ایک سطح تو انسان کی بنیادی ضرورتوں کی ہے کہ پانی، رہائش، غذا چاہیے۔ یا آپ اسے روٹی کپڑا اور مکان کہہ لیجیے۔ لیکن جب یہ بنیادی ضرورتیں پوری ہونے لگتی ہیں تو انسان کے پھر حوصلے بڑھتے ہیں، Aspirations ہوتے ہیں، وہ اور آگے کی سوچتا ہے۔ بہتر یا بلند معیار زندگی، جمالیاتی حسن، سماجی انصاف، سیاسی حقوق ...... وہ ان سب کے بارے میں سوچتا ہے اور سوچتا ہی نہیں ہے ان کا مطالبہ بھی کرنے لگتا ہے۔ غیر جمہوری حکومت اس طرح کے مطالبوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ تو تشدّد ان کو اس طرح کے مطالبوں سے باز رکھنے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے کہ بنیادی ضروریات کی سطح سے آگے سوچنے اور مانگنے کا حوصلہ مت کرو، یہ تمہاری پس

ماندگی کی حد ہے، اس سے آگے بڑھنے کا خواب بھی مت دیکھنا ورنہ وہ مار پڑے گی کہ پھر ہاتھ پیر توڑ دیے جائیں گے۔

انور سن رائے: ہاتھ پیر توڑ دینے پر اکتفا نہیں کرتے۔ ظلم کی انتہا Horror بن جاتی ہے۔ اس کے بعد جیسے اس کتاب میں ہے کہ ایک عورت کا نوحہ ہے، ماتم ہے۔ میرے ایک جاننے والے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ایک زمانے میں ایک سیاسی تنظیم کے لیے سرگرم تھے۔ بعد میں ان کا کوئی ...... جیسا کہ ہوتا ہے، ان کی شادی کا معاملہ ہوا تو ان لوگوں نے شرط یہ رکھی کہ آپ یہ سیاسی سرگرمیاں بند کر دیں، تب ہم شادی کا سوچیں گے۔ تو خیر انہوں نے زور ڈالا۔ لڑکے نے سیاسی سرگرمیاں بند بھی کر دیں۔ لیکن جیسے ہی پولیس کو ضرورت پڑی ...... ہمارا نظام تو یہ ہے کہ پولیس سے کہا جاتا ہے کہ مجرموں کو پکڑنا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس کے اصل مجرموں تک رسائی ہو نہ ہو، ایک تعداد پوری کر کے دینی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ یہ ہوا اس کے بعد پولیس والوں نے دیکھا کہ اس علاقے میں ان کی فہرست میں کون کون سے لوگ تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ اس لڑکے کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ گھر والوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہوگیا۔ ہم سب نے کوشش کی کہ پتہ کریں کہ کہاں ہے۔ تو جس جگہ وہ تھا، وہاں اس پر بے پناہ ٹارچر کیا گیا تھا۔ پھر اس کی حالت خراب ہوئی تو اسے جیل منتقل کر دیا گیا۔ جیل میں اس کا بھائی ڈھونڈتا ہوا پہنچا تو اس سے کہا گیا کہ اپنے بھائی سے معافی نامہ لکھوا دیں۔ اس لڑکے نے یہ کہا کہ جتنا بھی تشدد مجھ پر کر سکتے تھے، وہ تو کر لیا اب معافی نامہ کس بات کا۔ اور اگر میں لکھ بھی دوں تو کیا تشدد کا سلسلہ ختم ہو جائے گا؟ جو کام میں کر رہا تھا، وہی ٹھیک تھا۔ یعنی یہ ایک وجہ ہے جو یہ سلسلہ ختم نہیں ہو رہا کہ کوئی اور راستہ باقی چھوڑا ہی نہیں گیا ...... خیر، میں نے اس واقعے کا ذکر اس لیے کیا کہ اس لڑکے کا بھائی، جو میرا جاننے والا تھا، جب پہلی بار جیل میں اپنے بھائی سے مل کر آ رہا تھا اور اپنے بھائی کو جس حال میں اس نے دیکھا تھا تو اس کی اپنی حالت یہ تھی کہ وہ کوئی بات صحیح طور پر بتا ہی نہیں پا رہا تھا، جیسے وہ خود تشدد سے گزرا ہو۔ اس کی ماں، اسکی بیوی اور گھر کے دوسرے لوگ جو جیل

میں اس سے مل کر آئے' ان کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ وہ صحیح طور پر کچھ بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ جیسے ان کی گویائی چھین لی گئی ہو۔

ڈاکٹر ہارون احمد: ایک شخص کے بارے میں' میں بتاتا ہوں۔ اس کا بھائی کہیں شروع میں تھوڑا بہت سیاست میں حصہ لیتا تھا۔ اس کے بعد اس نے وہ سب چھوڑ دیا تھا اور ایک کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا جس میں لڑکے وڑکے بہت سے ہوتے تھے۔ وہ اس میں بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ لوگ آئے اور بندوق سے فائر کر کے مار ڈالا۔ وہ تو مر گیا' اس کے بعد خاندان پر مصائب ٹوٹے۔ اس آدمی کے ساتھ کیا ہوا' جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ایک تو جوان بھائی مارا گیا۔ اس کے بعد صبح کے وقت ایک گروپ آیا۔ شام کو دوسرا گروپ آیا۔ اگلے روز مجسٹریٹ آیا۔ تینوں اپنی ایک لسٹ لے کر آئے کہ آپ ایف آئی آر کٹوا دیں اور اس میں یہ نام لکھوا دیں کہ ان لوگوں نے قتل کیا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ میں نام کوئی نہیں لکھواؤں گا' اس لیے کہ میرا ایک بھائی جو زندہ ہے' اس کا بھی تو مسئلہ ہے۔ تو پھر علاقے کے مجسٹریٹ آئے اور انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو پروٹیکشن دیں گے آپ یہ نام لکھوا دیں۔ تو اس شخص کا مسئلہ تھا کہ میں اب کیا کروں۔ بھائی کی موت کو تو وہ رو پیٹ کر بیٹھ گئے' لیکن اب جو پریشر پڑ رہا ہے پورے خاندان کے اوپر' اس کا کیا کیا جائے۔ وہ سوچتا ہے میں کیا کروں' کہیں چلا جاؤں۔ اب اس خاندان کے اوپر پریشر ہے کہ یہ کرو ورنہ ہم تمہیں بھی ختم کر دیں گے۔ اس خاندان کے اوپر کیا گزر رہی ہے۔ تو اس طرح کے واقعات ہیں۔ ایک اور لڑکا ہے جس کو میرے پاس لے کر آئے۔ اس کا واقعہ یہ تھا کہ کسی زمانے میں سیاسی کام کرتا تھا' پھر چھوڑ دیا' باہر چلا گیا' پھر واپس آ گیا۔ لیکن وہی بات کہ جیسا آپ نے کہا' اس کا نام پولیس کے پاس تھا۔ تو ایک شام پولیس والے اٹھا کر لے گئے۔ محلے والے اسی وقت جمع ہو گئے تو پولیس والوں نے کہا کہ نہیں' نہیں' کوئی بات نہیں ہے' ہم پوچھ گچھ کر کے ابھی چھوڑ دیں گے۔ اگلے روز وہ لوگ تھانے گئے تو پتہ چلا کہ فوج لے گئی اس کو۔ ایک مہینے کے بعد انہوں نے اس کو واپس تھانے میں پہنچا دیا اور تھانے والوں نے گھر میں اطلاع دی کہ یہ آ گیا ہے' اس کو لے جائیے۔ اب

اس لڑکے کی یہ حالت تھی کہ میرے پاس جب اس کو لے کر آئے۔ وہ بیٹھا ہوا تھا تو اس کے جسم پر نشان تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہوا۔ اس نے کہا کہ کچھ نہیں۔ میں نے پوچھا' کہ کیا تمہیں مارا ہے' تو وہ کہنے لگا مجھے تو مارا ہی نہیں۔ وہ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے یہ ہاتھ اس کا ہے ہی نہیں۔ وہ اس سے اپنے آپ کو Dissocate کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر تمام نشانات ہیں مگر وہ ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ خاموش بیٹھا ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ یہ کیسے ہوا' یہ چوٹ کیسے لگی۔ ایک کان سے سنائی نہیں دے رہا۔ پوچھوں کہ کیا ہوا تو کہتا ہے پتہ نہیں۔ یہ تشدد کی انتہا ہے کہ وہ اپنے جسم کو بھی بھول رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہاں پر پہنچ کر کہانی ختم ہو چکی ہے۔

آصف فرخی : اور شاید یہیں سے ایک کہانی شروع ہوتی ہے۔ وہی کہانی جس کے ٹکڑے جوڑنے کی ہم سب کوشش کر رہے ہیں۔ جو ٹکڑا اس وقت سامنے ہے' اس پر خون کے اتنے چھینٹے کیوں ہیں؟

کراچی

۷ جنوری ۱۹۹۵ء

عمر ریو ابیلا کا ناول

REQUIEM FOR A WOMAN'S SOUL

شہرِ ستم میں اذیت کی مانوس داستان

ماتم ایک عورت کا

ترجمہ : آصف فرخی

اس کتاب کا دائرہ عمل لاطینی امریکا کا ملک ہے جہاں حکومت کی تبدیلی نے ایسی فوجی آمریت کو فروغ دیا کہ جس نے ملک پر شکنجے جیسی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے ہزاروں افراد کو "غائب" کروادیا۔ "غائب" ہوجانے والے ان بے نشان اور بے آسرا لوگوں کی پوری روداد کیسے معلوم ہوسکتی ہے، لیکن اس طویل اور اندوہ ناک داستان کے جو اجزاء سامنے آئے ہیں، وہ قید و بند، ظلم و تشدد اور اذیت کے نت نئے طریقے سہتے سہتے موت کی تفصیلات بتاتے ہیں۔ یہ ناول بھی ایسی ہی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس ناول کو چھپنے کے فوراً بعد ہی بہت پسند کیا گیا۔ مشہور امریکی ناول نگار نارمن میلر نے اسے غیر معمولی ادب پارہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ ناول انسانی وقار پر دہشت کی یورش اور اذیت اٹھانے والوں کی نفسیات کا مطالعہ ہے۔ ایک ناول نگار نے اسے صحیح معنوں میں "شاک" پہنچانے والی کتاب تسلیم کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ اسے پڑھیے اور روئیے۔ کرسچین سائنس مانیٹر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کتاب کو جھیل جانا مشکل ہے، یہ شدید مذمت کرتی ہے اذیت کے پورے سلسلے کی، ان حکومتوں کی جو اس کے لیے احکام جاری کرتی ہیں اور ان معاشروں کی بھی جو اسے برداشت کرلیتے ہیں۔

کیا اس آخری فقرے کی زد میں، ہم اور آپ نہیں آتے؟